UQAABI
مختصر تاریخ اُردو ادب
اور
اصنافِ نثر
حصہ دوم
عقابی
ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم

مختصر تاریخ اُردو ادب

اور

اصنافِ نثر

حصہ دوم

ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم
سینئر لکچرار اُردو ممتاز کالج
(ایم-اے، ایم-فل، پی-ایچ-ڈی)

نام کتاب	مختصر تاریخ اُردو ادب اور اصنافِ نثر
تصنیف	ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم
سنہ اشاعت	۲۰۰۶ء (بار اوّل)
تعداد	۳۰۰
صفحات	۱۴۰
قیمت	150/- روپے
کمپیوٹر کتابت	الاکرم گرافکس، سعید آباد، حیدرآباد فون : 9246152456
طباعت	اے۔ایس۔گرافکس، حیدرآباد
ناشر	بوستانِ اشہر

ملنے کے پتے

☆ بہ مکان مصنفہ مکان نمبر 22-8-526 کوچہ خطیب، پرانی حویلی، حیدرآباد-2 (اے-پی)
فون نمبر : 24526369

☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، پرانی حویلی، روبرو مسجد یکخانہ، حیدرآباد-2

☆ دارالکتاب، میورکشال کامپلکس، گن فاؤنڈری، حیدرآباد

"یہ کتاب اُردو اکیڈیمی آندھراپردیش کی جزوی مالی اعانت سے شائع کی گئی"

فہرس

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

اِنتساب

میری والدہ قمرالنساء بیگم (ٹیچر)

میرے بچوں

مرزا محمد علی بیگ و مرزا رضا علی بیگ (انجینئرس)

اور

اہلِ خانہ (سسرال) کے نام

جن کی محبتیں، خلوص اور اشتراک
میرے سفرِ زندگی کے لئے زادِ راہ ہیں

ٹُوٹ کر برسے خدا مُجھ پہ ترا ابرِ کرم

عِلم کے بحر سے سیراب ہو زہرؔا کا قلم

لِکھی تاریخ ادب ، فکرِ رسا کی حامل

اِستفادہ جو کریں پائیں ترا فیض اتم

ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم

ابتدائیہ

ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اُردو" کی پہلی جلد آج سے کوئی تیس (۳۰) سال قبل شائع کی تھی جس میں بقول صاحبِ موصوف "فارسی روایت نے اُردو زبان وادب کو مالا مال کر کے اُسے نہ صرف نئے اصناف واسالیب اور کنایات واساطیر دیئے بلکہ اس نئے طرزِ احساس نے جدید دائرے کی طرف رُخ موڑ دیا" (ط) ان کی اس تاریخ میں اُردو ادب کو ترتیبِ زمانی یا ادوار کی صورت سے دیکھا تو گیا لیکن اصنافِ شعروادب کی وضاحتیں نہیں ملتیں یہی حال کم وبیش بعد کی لکھی جانے والی تاریخوں کا ہے جب کہ کوئی سوا سو برس پہلے بحر الفصاحت (طبع اول ۱۳۰۳ھ) غالباً وہ پہلی کتاب ہے جس میں منشی نجم الغنی خاں رامپوری نے اصنافِ شعری کی ہیئتیں ان کی تراکیب معہ مثالیں درج کی تھیں اور اقسامِ نثر کی تفصیلات بھی، گذشتہ برس ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم نے اُردو زبان وادب کی ہمہ گیریت، اہل ذوق وشوق نیز طلباء کی سہولت کے لئے خصوصاً درس وتدریس کے مدنظر "مختصر تاریخ اُردو ادب اور اصنافِ شاعری" تالیف کی، انھیں اس بات کا احساس وادراک تھا کہ تاریخ نویسی اور اصنافِ سخن کے سلسلے میں ہمارے بہت ہی قابل ماہرین ومعتبر اساتذہ نے کتابیں لکھی ہیں تاہم بقول موصوفہ "ان وقیع اور اہم کتابوں کا ہر کالج کے کتب خانے میں موجود رہنا ضروری نہیں اور اگر ان میں سے چند کتابیں موجود ہوں تب بھی ذوقِ مطالعہ، سہل انگاری کے سبب طلباء میں ان ضخیم تصانیف کو پڑھنا دشوار نظر آتا ہے" (حرفِ آغاز صفحہ ۱۱) چنانچہ انھوں نے اپنی پہلی کتاب میں روایتی شعری اصناف جیسے مثنوی، قصیدہ، غزل، مرثیہ، رباعی، نظم وغیرہ کی تمام ہیئتوں ان کی فنی خصوصیات کو پیش کیا جب کہ اُردو میں داخل ہونے والی نئی نئی شعری اصناف جیسے ثلاثی، دوہے، ماہیے، ترائیلے، ہائیکو وغیرہ

بلکہ نثری شاعری پر اظہارِ خیال کیا، اور اب اپنی کاوشوں کو اقسام نثر کی ذیل میں ''مختصر تاریخ اُردو ادب اور اصناف نثر'' کی صورت سے شائع کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم عثمانیہ یونیورسٹی اور سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کی فارغ درس و تدریس سے وابستہ ممتاز کالج کے شعبۂ اُردو کی صدر ہیں، طبعاً خاموش جویائے علم، شاعرانہ ذوق کی حامل، طلباء و اساتذہ برادری میں مقبول سلیقہ شعار خاتون ہیں اس عاجز سے بھی تدریسی ربط وضبط رکھتی ہیں۔ پچھلے دو برسوں سے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے ایم۔اے فاصلاتی کلاسس کے دوران اُن کی استعداد علمی ولیاقت سے واقفیت ہوئی، اپنی پہلی کتاب کے اشاعتی مراحل میں میرے مشوروں پر عمل کیا اور اب اس کتاب کے سلسلے میں بھی وہی رویہ اختیار کیا یہ اُن کی نیک نفسی ہے۔

ڈاکٹر زہرا بیگم نے ادبی تاریخ کی اِس دوسری جلد میں قدیم ہیئتوں کے ساتھ ساتھ جدید صورتیں کی بھی تفصیل فراہم کی ہے یعنی جدید اُردو نثر کی مختلف شکلوں اور ان کے چلن کے بارے میں بڑے احتیاط اور احتساب سے کام لیا ہے۔ اختصار و ایجاز کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور یہی اُن کا کمال ہے انھیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ماہرین ادب کے اکتساب و استفادہ سے جو کام انجام دیا گیا وہ طلباء اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے سودمند ثابت ہوگا، فہرست کتاب پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر زہرا بیگم نے دانستہ اور شعوری طور سے اس امر کا اہتمام کیا کہ اُردو نثر کے آغاز سے تا حال تمام اصناف پر موزوں و مناسب معلومات فراہم کئے جائیں اور بلا کسی بحث و مباحثہ، نتائج کی نشاندہی بھی ہو، اس کے لئے مؤرخانہ نہج و اسلوب کو بھی اپنایا ہے۔ سلسلۂ معروف نثر نگاروں کے احوال اور ان کے کارناموں کو بحسن وخوبی پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک مشکل کام تھا مگر مؤلفہ نے کامل یکسوئی انہماک اور دل جمعی سے یہ مرحلہ طے کیا۔ دراصل یہ ان کی طبعی موزونیت ذاتی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے نثری اقسام کو موضوعات کی روشنی میں درج کیا ہے، جس سے قاری کو اصناف نثر اور ان سے متعلق تحریروں کی ندرت سمجھ میں آتی ہے بالفاظ دیگر ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم نے یہ سعی وکاوش موجودہ تعلیمی کلچر کی ضرورتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کی ہے۔

عبارت مختصر! تاریخی اہمیت اور تدوینی افادیت کے ساتھ نثری اقسام کو باعتبار ہیئت اور

باعتبار معنی سمجھنے اور سمجھانے کی خاطر لکھی یہ تاریخ ادب اُردو اور اصنافِ نثر، اُردو میں مروجہ نثری اصناف کی واضح اور صاف نقوش پیش کرتی ہے، مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم کی پچھلی تحقیقی و تنقیدی مواد سے بھرپور کتاب کی طرح یہ تازہ تصنیف، ادبی حلقوں خصوصاً طلباء برادری میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل کرلے گی، بقول شخصے نقاش نقش ثانی بہتر کند زِاوّل کے مصداق مؤلفہ نے اس کتاب کی پیش کشی میں دانش و بینش سے کام لیا ہے اور بجا طور پر مبارک باد کی مستحق ہیں۔

۲۹/ڈسمبر ۲۰۰۶ء

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
سابق صدر شعبۂ اُردو
عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

عرضِ حال

میری پہلی کتاب 'مختصر تاریخ اُردو ادب اور اصنافِ شاعری' میں اُردو زبان کی تاریخ شاعری کا آغاز وارتقاء اور اس کے دبستانوں نیز شعری اصناف پر روشنی ڈالی گئی تھی جو طلباء کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ پیش نظر کتاب اسی کی دوسری کڑی ہے۔ اس کا موضوع وہی ہے لیکن اس میں اُردو نثر کا آغاز وارتقاء اس کی ترقی میں مختلف کالجوں اور کالجوں کے باہر ادبی خدمات، جدید اُردو نثر کے علاوہ اس کی مختلف اصناف کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اُردو کے شعری اصناف کی طرح نثری اصناف بھی طلباء کے لئے کافی کارآمد ہوں گے۔

اُردو زبان وادب کی تاریخ اور نثری اصناف پر یوں تو کئی ضخیم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جو شائد طلباء کی پہنچ اور ان کے فہم وادراک سے بعید ہیں جن میں یہ موضوع انتہائی بلند اور معیاری انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اسے مختصر آسان اور عام فہم بنا کر طلباء کی سہولت کے لئے پیش کرنا ہی میرے مطمح نظر ہے۔ اس سلسلے میں ''اُردو نثر کا فنی ارتقاء'' از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ''ترقی پسند ادب'' پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی مایہ ناز تصانیف ہیں لیکن ان تصانیف میں ہر صنف کو کئی کئی صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔

عصر حاضر کے طلباء کا معیار اتنا بلند نہیں کہ وہ ان تصانیف سے استفادہ کریں۔ مزید ان تصانیف میں تمام نثری اصناف کا احاطہ بھی نہیں کیا گیا۔ اس طرح طلباء میں تشنگی کا احساس برقرار رہا۔ دوران تدریس اس تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے راقم السطور نے حتی المقدور اسے دور کرنے کی ایک سعی وکوشش کی ہے جسے ماہرین ادب کے مقابلے میں ایک طالب علمانہ کوشش کہی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ کے لئے نہیں لکھی گئی بلکہ صرف طلباء کے لئے لکھی گئی ہے۔

یہ کتاب کل سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اُردو نثر کے آغاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔طلباء کی سہولت کی خاطر نثر کا تعارف اوراس کی قسموں کو بیان کیا گیا ہے۔ دکن میں اُردو نثر کے آغاز اور اُردو نثر کے ابتدائی نمونوں میں ''خیرالبیاں'' نامی تصنیف کا تذکرہ کیا گیا جسے اُردو کی پہلی مستند کتاب مانا گیا ہے۔ اُردو نثر کے نمونوں میں برہان الدین جانم، شاہ امین الدین اعلیٰ اور ملا وجہی کی سبرس کا تفصیلی ذکر کیا گیا۔

دوسرے باب میں اُردو نثر کے ارتقاء کے سلسلے میں فورٹ سینٹ جارج کالج (مدراس) کی خدمات کا بیان ہے۔ جس کے تحت دکنی انوار سہیلی، دکنی سنگھاسن بتیسی اور داستانِ الف لیلیٰ منظر عام پر آئے۔اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کا تذکرہ ہے جس نے اُردو کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔اس کالج کے قیام کے سبب ہی اُردو کتابوں کا بیش بہا سرمایہ جمع ہو پایا۔ کالج کے کل دس مصنفین اوران کے تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے جن میں میر امن کا نام سرفہرست ہے۔

تیسرے باب میں فورٹ ولیم کالج سے باہر اُردو نثر کی ترقی کا احاطہ کیا گیا ہے اس سلسلے میں عیسائی ادیبوں کے کارناموں اور قرآن مجید کے ترجموں کے تذکرے کے علاوہ انشا اللہ خاں انشاء، فقیر محمد خاں گویا اور رجب علی بیگ سرور کی نثری تصانیف کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس باب کا اہم تذکرہ مرزا غالبؔ کا ہے جنھیں نثر نگار کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اُردو ادب میں ان کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اُردو نثر کے ارتقاء میں دہلی کالج کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اس کے تحت کالج کے پرنسپلس، کالج کے اساتذہ اور قدیم طلباء کے ذکر کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کا ذکر گویا دہلی کالج کی تاریخی کارکردگی کا اعتراف ہے۔

کتاب کے پانچویں باب میں جدید اُردو نثر کے آغاز و ارتقاء کے سلسلے میں سرسید احمد خاں اوران کے رفقاء کی خدمات خصوصیت سے محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، محسن الملک، مولوی چراغ علی، ذکاءاللہ اور وقار الملک کی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں اخبار اودھ پنچ کی خدمات اوراس سے وابستہ آٹھ صحافیوں کے کارناموں پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔ اودھ پنچ کے سلسلے میں منشی سجاد حسین کی شخصیت مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور اکبرالہ آبادی کے نام اہم ہیں۔ چوں کہ اودھ پنچ طنز و مزاح سے عبارت ہے اسی لئے اس تذکرے کے بعد اُردو میں آزادی سے قبل اور تقسیم ہند کے بعد کے مزاحیہ ادب کا مختصراً احاطہ کیا گیا اور نامور مزاح نگاروں میں ابن انشاء، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری پر مختصراً روشنی ڈالی گئی۔

ساتویں اور آخری باب میں اصناف نثر پر تفصیلی گفتگو کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید دونوں اصناف یعنی داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، خاکہ، انشائیہ، سوانح نگاری، خودنوشت سوانح، آپ بیتی، خطوط نگاری، سفرنامہ، رپورتاژ، مضمون نگاری، مقالہ نگاری وغیرہ کا تعارف کروایا گیا۔ طلباء کی دلچسپی اور معلومات کے لئے ناول نگاروں، افسانہ نگاروں، ڈرامہ نگاروں اور صحافیوں کے احوال، ان کی متعلقہ کتابوں کا جائزہ پیش کیا گیا۔

اس کتاب کی پیش کش کے سلسلے میں سب سے پہلے میں خالق کائنات کی عظمت کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرتی ہوں کہ جس نے اپنے حبیب اور بزرگ و برگزیدہ ہستیوں کے تصدق میں میرے احساس اور میرے قلم کو اس قابل بنایا کہ طلباء کی ضرورتوں کو محسوس کرتے ہوئے کچھ تحریر کروں۔

والدہ محترمہ کی دلی دُعائیں، میرے شریک حیات کی ہمت افزائی، میرے بچوں اور افراد خانہ کا تعاون ہی اس کتاب کی تکمیل کا باعث ہوا۔ بالخصوص ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشہیر کے پر خلوص مشوروں کے لئے میں ان کی شکر گذار ہوں۔ حتیٰ کہ کتاب کی ''پروف ریڈنگ'' کا تصور بھی ان کے بغیر محال تھا۔

پہلی کتاب کے منظر عام پر آنے کے بعد، دوسری تصنیف سے متعلق میرے دوستوں اور بہی خواہوں کے استفسار نے مجھے سلسلۂ تحریر کو جاری رکھنے پر آمادہ کیا۔ جس کے لئے میں ان تمام کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

استاد محترم ڈاکٹر عقیل ہاشمی صاحب کی میں بے حد ممنون و سپاس گذار ہوں کہ اس سلسلے میں انھیں میں نے کافی زحمت دی لیکن استاد محترم نے کبھی اُسے بار خاطر نہ سمجھا۔ ان کی طبیعت کی سادگی

ہی ان کی بڑائی کی ضامن ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو ایک طالبِ عالم تصور کرتے ہیں ان کی یہی سادگی طالبانِ علم کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔

میر اکرم علی صاحب نے پہلی کتاب کی مختصر سے وقت میں خوش اسلوبی سے طباعت کے سبب مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں اس بار اس فکر سے بے نیاز رہی۔ اس کتاب کے سلسلے میں بھی موصوف کے خلوص اور یکسوئی نے میرے اعتماد میں مزید اضافہ کیا۔ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود جس دلچسپی سے انھوں نے یہ کام کیا ہے، اس کے لئے نہ صرف وہ میرے شکریہ کے حق دار ہیں بلکہ ان کے بہتر مستقبل اور کامرانی کے لئے میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔

یہ کتاب خصوصاً طلباء برادری کے لئے لکھی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کے لئے معاون ثابت ہوگی۔

زہراؔ کی جانفشانی کا بس ہے یہی صلہ
پڑھیئے اِسے تو خوب ہے ورنہ نہیں گلہ

۳۰/ڈسمبر ۲۰۰۶ء

ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم
سینئر لکچرار ممتاز کالج
ملک پیٹ، حیدرآباد

☆☆☆

پہلا باب
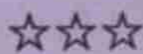
اُردو نثر کا آغاز

اُردو زبان و ادب کی مختصر تاریخ اور اُردو زبان کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات اور ادب کی تعریف جلد اول میں کی جا چکی ہے۔ واضح رہے کہ کسی بھی زبان کا ادب نظم اور نثر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ہر زبان کے ادب کی ابتداء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نظم سے ہوئی نثر کو ثانوی درجہ دیا گیا۔

اُردو زبان کا آغاز بھی شمالی ہند میں نظم سے ہوا اور پھر یہ زبان اپنے بولنے والوں کے ساتھ جنوبی ہند آئی۔ نثر کے مقابلے میں عام طور پر نظم زیادہ پسند کی گئی۔

نظم ہو کہ نثر ابتداء میں ہر دو پر مذہبی رنگ غالب رہا۔ جنوبی اور شمالی ہند میں جو نظم یا نثر لکھی گئی اس میں زیادہ تر مذہبی موضوع ہی پر قلم اُٹھایا گیا۔ لیکن جب زبان میں پختگی آتی گئی تو مذہبی موضوع کا غلبہ کم ہونے لگا اور مذہبیت کی جگہ ادبیت نے لے لی۔ ابتدائی نظم اور نثر پر مذہبیت کا پہلو اس لئے غالب رہا کہ اس زبان کی نشو و نما میں صوفیائے کرام نے بڑا حصہ لیا ہے۔ مذہبی تعلیم اور تبلیغ کے لئے ان بزرگوں نے اُردو زبان کو اس لئے اپنایا کہ وہ سارے ہندوستان کے لئے عام فہم اور رابطہ کی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ زبان کی نشو و نما کے تحت صوفیائے کرام کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے چنانچہ خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید حمید الدین ناگوری اور شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی وغیرہم کی تحریریں ملتی ہیں۔

اُردو نثر کے آغاز اور اس کی پہلی تصنیف سے متعلق تفصیلات بیان کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ اُردو کے طلباء کے لئے نثر کا تعارف بھی کروایا جائے تا کہ نظم اور نثر کے مابین فرق کو وہ بہ آسانی سمجھ سکیں۔

نثر کا تعارف

نثر کے لغوی معنی پراگندہ، تتر بتر اور بکھرا ہوا کے ہیں۔ یعنی وہ عبارت جو منظوم نہ ہو نثر کہلاتی ہے۔ نثر جملوں یا عبارت پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب کہ نظم اشعار پر مبنی ہوتی ہے۔ عمیق حنفی بڑے دلچسپ انداز میں نثر کو شہد جمع کرنے سے تعبیر کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ شعر کے مقابلے میں نثر کا انداز تفصیلی ہوتا ہے۔ شاعری میں ایک طویل عبارت کو محض ایک یا دو اشعار میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اشعار کی تشریح کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ یعنی ایک شعر کی تشریح تقریباً پانچ یا چھ جملوں میں کی جاتی ہے۔

نثر کی قسمیں

الفاظ کے اعتبار سے نثر چار قسموں پر مشتمل ہے۔

نثر مرجز

ایسے دو فقرے جس میں الفاظ ہم وزن ہوں لیکن قافیہ نہ ہو۔

نثر مقفی

ایسی نثر جس کے فقروں کے آخری کلمات قافیہ پر ختم ہوتے ہیں۔

نثر مسجع

ایسی نثر جس کے دونوں فقروں میں مساوی الفاظ کا استعمال نہ ہو نثر مسجع کہلاتی ہے۔

نثر عاری

عاری کے معنی ''خالی'' کے ہیں چنانچہ ایسی نثر جو مقفی، مسجع اور مرجز بھی نہیں ہوتی بلکہ سادہ سلیس اور رواں ہو عاری کہلاتی ہے۔

دکن میں اُردو نثر کا آغاز

ایک طویل عرصے تک یہی خیال غالب رہا کہ فضل علی فضلی کی ''دہ مجلس'' یا ''کربل کتھا'' ہی اُردو نثر کی پہلی تصنیف ہے جو محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ م ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی۔ بعد ازاں کی گئی تحقیق کے مطابق یہ نظریہ محض ایک خیال خام ثابت ہوا۔ اُردو نثر کے سلسلے میں بھی جب محققین کی نظریں سر

زمین دکن پر پڑیں تو اُردو نثر نگاروں کا ایک سلسلہ دکن میں نظر آیا۔

جیسے اُوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ابتدائی نثر مذہبی موضوع سے مغلوب رہی۔ آٹھویں صدی ہجری میں شیخ عین الدین گنج العلم کے دکنی رسالے سب سے زیادہ قدامت کے حامل ہیں۔ گنج العلم کا انتقال ۷۹۵ھ م ۱۳۹۲ء میں ہوا۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۸ویں صدی ہجری م ۱۴ویں صدی عیسوی میں اُردو نثر منظر عام پر آچکی تھی۔ لیکن یہ رسالے ناپید ہیں۔ ۹ویں صدی ہجری میں نثری تصنیف ''معراج العاشقین'' نے کافی شہرت پائی۔ یہ ایک طویل عرصے تک خواجہ بندہ نواز گیسودراز سے منسوب رہی۔ لیکن اس سے متعلق یہ حقیقت منظر عام پر آچکی کہ یہ مخدوم شاہ حسینی کی ''تلاوت الوجود'' کا خلاصہ ہے۔ اس کے علاوہ عبدالقادر جیلانی کے رسالے ''نشاط العشق'' کے دکنی ترجمے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جو سید محمد عبداللہ حسینی نبیرہ بندہ نواز نے کیا ہے۔ ۱۰ویں صدی ہجری کے آغاز میں شاہ میراں جی شمس العشاق نے وفات پائی۔ شمس العشاق ایک تاریخی لقب ہے جس سے ۹۰۲ھ نکلتا ہے ان کے دکنی رسالے ''شرح مرغوب القلوب'' خوش نامہ، شہادت التحقیق، جل ترنگ اور گل باس وغیرہ نثری رسالے ہیں جو مذہبی اور لسانی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ وصیت النور بھی اس دور کی تصانیف میں اہم ہے۔

اُردو نثر کے ابتدائی نمونوں کے ذکر اور ان کی ترتیب میں ''خیر البیان'' نامی تصنیف کا ذکر ملتا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کے مطابق اس کا مصنف پیر روشاں بایزید انصاری متوفی ۹۸۰ھ ہے۔ موصوف نے ''اُردو کی پہلی مستند نثری کتاب'' کے عنوان کے تحت اس کتاب سے متعلق تفصیلات بتائی ہیں کہ اس کتاب کا مصنف کسی مذہبی تحریک کا بانی تھا۔ اپنی کتاب خیر البیان میں مصنف نے ایک مضمون کو چار زبانوں یعنی عربی، فارسی، پشتو اور اُردو میں لکھا۔ اس کتاب کو محمد عبدالقدوس قاسمی نے مرتب کر کے ۱۹۶۷ء میں پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی سے شائع کیا۔

تصنیف خیر البیان کی عبارت کا نمونہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ جلد اول میں اس طرح ملتا ہے:

''لکھ کتاب کے آغاز کے بیان جن کے سارے اکھر سہن بسم اللہ تمام میں نہ

گنوانوں گا مزدوری انمن کی جے لکھیں پرن بگاڑں اکھر کہ تمکنی پرن لکھیں اسی کارن جے کہی ہوئے بیاں......قرآن میں ہے"۔[1]

برہان الدین جانم متوفی ۹۹۰ھ م ۱۵۸۲ء

۱۶ ویں صدی عیسوی کے مذہبی نثری سرمائے کے تحت شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کا نام ملتا ہے۔ جو شاہ میراں جی کے خلیفہ بھی تھے۔ اپنے والد کی جانشینی کا پورا حق ادا کرتے ہوئے انھوں نے تبلیغ وہدایت کے سلسلے کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور نظم ونثر پر مبنی کئی رسالے لکھے۔ نثری رسالوں میں "کلمۃ الحقائق"، "ہشت مسائل" اور "ذکر جلی" قابل ذکر ہیں۔ ان رسالوں میں مصنف نے تصوف کے مسائل کو آسان اور عام فہم انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ جانم نے کہیں اپنی زبان کو گوجری اور کہیں اُردو لکھا ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں صرف "کلمۃ الحقائق" ہی شائع ہوئی۔

شاہ امین الدین علی اعلیٰ

جانم کے بعد ان کے فرزند شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا نام ملتا ہے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ یہ اپنے والد کے انتقال کر جانے کے بعد اس دُنیا میں آئے۔ والد کی تربیت سے محروم رہے لیکن ان کے مریدوں کے درمیان ہی پرورش پائی اور حسبِ روایت اپنے والد کی مسند سنبھالی رفتہ رفتہ آپ کے مریدوں کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچ گئی۔ ان کے عہد میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ بڑی زور وشور سے چلتا رہا۔ اعلیٰ کی مشہور تصنیف "گنج مخفی" ہے۔ ان کی تصانیف نظم اور نثر دونوں پر مشتمل ہیں۔ اپنے بزرگوں کے مقابلے میں ان کی زبان صاف اور رواں ہے۔ اعلیٰ نے اپنی زبان کو دکنی اور ہندی کا نام دیا ہے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ کی پرگوئی اور ان کی تحریروں کی کثرت کا اندازہ ہم ڈاکٹر حسینی شاہد کے مقالے سے لگا سکتے ہیں کہ حسینی شاہد نے آپ کی علمی وادبی خدمات پر "دکنی ادب کی ترقی میں شاہ امین الدین اعلیٰ اور ان کے خلفاء کا حصہ" کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ ان کے شاگردوں میں میراں جی خدانما کی اہمیت زیادہ ہے۔ شاگردوں کی تعداد کافی ہے اور تقریباً شاگردوں کی

---

[1] تاریخ ادب اُردو جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی صفحہ ۲۰۳

تخلیقات ملتی ہیں۔ یہ تمام تصانیف اُردو نثر کا بیش بہا سرمایہ ثابت ہوتی ہیں۔ اُردو نثر کے ابتدائی اور اولین نقوش ہونے کے سبب ان کی اہمیت زیادہ ہے۔ یہ بات اور ہے کہ ادبی عنصر اس میں تلاش کرنا بیکار ہے۔ ان تمام تصانیف پر صوفیانہ رنگ طاری ہے۔ یہ ہدایت ونصیحت اور پندوموعظت سے لبریز ہیں۔ اگر چیکہ یہ ادبی تصانیف نہیں لیکن اس کے باوجود ادب کا محقق اور مورخ اس سے اپنی نظریں پھرا نہیں سکتا۔

اُردو نظم ہو یا نثر سب سے پہلے مورخ کی نظریں اسی مذہبی سرمائے پر پڑتی ہیں اور محقق کے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ نظم ونثر کی ابتداء کے تحت وہ اُردو میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیتا ہوا اپنی تصنیف کا آغاز کرے۔ ان تفصیلات کے بغیر مقالے میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے زبان بھی صاف اور سلیس ہوتی گئی اور انداز بیان بھی عام فہم ہوتا گیا۔

۱۱ویں صدی ہجری کا مایہ ناز اولین ادبی کارنامہ ملا وجہی کی تصنیف سبرس ہے جو ۱۰۴۵ھ م ۱۶۳۴ء میں لکھی گئی۔ یہ اُردو کی پہلی داستان قرار پاتی ہے ہوسکتا ہے کہ اس سے قبل بھی کوئی داستان لکھی گئی ہو لیکن چوں کہ اب کسی اور کتاب کا وجود ہی نہیں ملتا لہٰذا اب تک کی تحقیق کے مطابق سبرس ہی پہلی داستان ہے۔

سبرس

سبرس چوں کہ اُردو ادب کی پہلی داستان قرار پاتی ہے لہٰذا اس تصنیف اور اس کے مصنف سے متعلق مختصر سا بیان ضروری ہے۔ ملک الشعراء اسداللہ وجہی قطب شاہی دور کا ایک بلند پایہ شاعر اور ادیب تھا اس نے تقریباً تین قطب شاہی بادشاہوں کا عہد دیکھا۔ قطب شاہی دور کے چوتھے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد ۱۵۵۰ء-۱۵۸۰ء میں پیدا ہوا، اُسے بچپن ہی سے شعر گوئی کا شغف تھا نتیجتاً کمسنی ہی میں مقبولیت حاصل کی اور عہد ابراہیم قطب شاہ ہی میں استاد سخن کی حیثیت حاصل کر چکا۔ عہد محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء-۱۶۱۱ء میں اسے ملک الشعراء ہونے کا اعزاز ملا اور عہد عبداللہ قطب شاہ ۱۶۲۷ء-۱۶۷۲ء بھی دیکھا۔ وجہی کی تصانیف کے نام اس طرح ملتے ہیں مثنوی ''قطب مشتری''، ''سب رس''، ''تاج الحقائق'' اور دیوان وجہی (فارسی) وغیرہ۔ وجہی کی مثنوی قطب

مشتری کا شمار بھی نہ صرف جنوبی ہند کی مشہور و معروف مثنویوں میں ہوتا ہے بلکہ اُردو زبان کی تین مشہور زمانہ مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس مثنوی میں وجہی نے بادشاہ وقت محمد قلی قطب شاہ کو ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے بنگال کی شہزادی مشتری سے اس کی عشقیہ داستان کو بیان کیا ہے۔

سب رس ملا وجہی کی دوسری تصنیف ہے۔ سب رس صرف اُردو نثر کی قدیم داستان ہی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی اُردو نثر کے دو تین منتخب شاہکاروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس داستان میں وجہی نے انسانی جذبات اور احساسات مثلاً غصہ، محبت اور رشک وغیرہ کو پیش کیا ہے اور انسانی اعضاء و صفات عقل، دل، حسن اور وفا کو کرداروں کی حیثیت دی ہے۔ اگرچیکہ اس کا قصہ فارسی کے مشہور قصے پر مبنی ہے جو فتاحی کی تصنیف ہے لیکن شاعر نے صرف قصے کا ڈھانچہ فارسی زبان سے مستعار لیا ہے باقی آب و رنگ سب مصنف کے ذہن کی پیداوار ہے جو مرصع نثر میں لکھی گئی ہے۔ ایک طویل عرصے تک جنوبی ہند میں وجہی جیسا نثر نگار پیدا نہیں ہوا۔ اپنی تصنیف سب رس سے متعلق خود مصنف سب رس میں لکھتا ہے :

"آج لگن کوئی اس جہان میں، ہندوستان میں، ہندی زبان میں، اس لطافت اس چھنداں سوں، نظم ہور نثر ملا کر گلا کر یوں نہیں بولیا"۔ [1]

سب رس وہ نثری کارنامہ ہے جو وجہی کے نام کو اُردو ادب میں ہمیشہ زندہ جاوید رکھے گا وجہی نے بڑے دلچسپ انداز میں حسن و عشق کی کشمکش اور دل و عشق کی معرکہ آرائی کو سب رس میں قصے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس داستان سے اس دور کی طرزِ معاشرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ داستان کی مسجع اور مقفی عبارت اس طرح ملتی ہے :

"عقل کو بغیر دل کوں نور نئیں، عقل کو خدا کہنا بھی کچھ دور نئیں"۔ [2]

ملا وجہی ایک بلند پایہ شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ بلند پایہ عالم و مفکر بھی تھا۔ آج سے ساٹھ

---

[1] اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ   احتشام حسین   صفحہ ۷۷

[2] اُردوئے قدیم   صفحہ ۴۰

سال قبل مولوی عبدالحق نے ملا وجہی کی دونوں تصانیف مثنوی قطب مشتری اور سبرس کو شائع کیا تھا۔

سبرس کے بعد دکن میں اُردو نثر کی اور بھی تصانیف منظر عام پر آئیں لیکن ان میں بھی مذہبی موضوع غالب رہا چنانچہ سبرس جیسی شہرت کسی اور تصنیف کے حصے میں نہ آئی۔

سبرس جیسی ادبی تصنیف کے منظر عام پر آنے کے بعد بھی دکن میں مذہبی تصانیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۰۷۶ھ م ۱۶۶۷ء میں میراں یعقوب نامی بزرگ نے شمائل الاتقیا اور دلائل الاتقیا کا دکنی میں ترجمہ کیا۔ سبرس کے بعد دکن میں ابن نشاطی کی ''طوطی نامہ'' داستان کی حیثیت رکھتی ہے جو ادبی انداز کی دوسری داستان ہے لیکن سبرس کی طرح اس داستان کی زبان اتنی ادبی نہیں اور نہ ہی اس دوسری داستان نے سبرس کی طرح اہمیت حاصل کی۔ اس داستان سے متعلق تھوڑی سی تفصیلات اس طرح ملتی ہیں کہ پنچ تنتر کی کہانیوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور فارسی کی ان کہانیوں کو دکنی اُردو میں ڈھالا گیا ہے۔ بہر حال اُردو نثر یا دکنی اُردو کی یہ دوسری داستان ہے۔ اس طرح دوسری زبان میں لکھی گئی داستانوں کو بھی دکنی زبان میں پیش کیا گیا۔

دکنی ادب کی تاریخ پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرزمین دکن کو اُردو ادب کا معدن قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تقریباً تمام اصناف کی ابتدائی نشو و نما یہیں سے ہوئی چنانچہ اُردو کی نثری صنف داستان گوئی کا آغاز بھی دکن ہی سے ہوا اور سبرس اُردو زبان کی پہلی داستان قرار پائی۔

اورنگ زیب کے ورود دکن اور سقوط گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد دکن علماء اور ادیبوں سے خالی ہونے لگا اگرچہ اورنگ زیب کے دور میں بھی بزرگوں کے ایک دو نام ملتے ہیں جنھوں نے دکنی زبان میں مذہبی رسالے یا کتابیں لکھی ہیں ان میں سید شاہ محمد قادری کے مذہبی رسالے اور سید شاہ میر کے ''اسرار توحید'' کا تذکرہ ملتا ہے۔

بعد ازاں علمائے دکن کو مجبوراً دکن چھوڑنا پڑا۔ اور یہ مختلف حصوں میں بکھر گئے۔ سرزمین دکن کے ادیبوں اور علماء کے دکن چھوڑنے سے متعلق ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال اپنی تصنیف ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے علمی ادارے فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج کا تقابلی و تنقیدی جائزہ'' میں رقم طراز ہیں :

"سقوط گولکنڈہ و بیجاپور کے بعد ارباب علم وادب کو دکن کی سرزمین چھوڑنی
پڑی اور قدردانوں کی تلاش میں انھوں نے آرکاٹ کا رُخ کیا کیوں کہ یہاں
ایسے حکمرانوں کا اثرواقتدار باقی تھا جو زبان وادب کے سچے قدردان اور مرتبہ
شناس تھے آرکاٹ کے نوابین انگریزوں کے زیرنگیں ہونے کے باوجود محدود
وسائل سے علماء اور اہل ہنر کی قدرافزائی میں مصروف تھے"۔ [1]

اُردو زبان وادب اور اُردو نثر کے سلسلے میں جس طرح فورٹ ولیم کالج اہمیت کا حامل ہے
جس نے شمالی ہند کے اُردو نثر کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ بالکل اسی طرح سے فورٹ سینٹ جارج
کالج نے دکنی ادب کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ اس کالج نے بھی دکنی ادب کے سلسلے میں
کافی شہرت پائی۔ لیکن عام طور پر تاریخ اُردو ادب کی تصانیف نے اس کالج سے متعلق بہت کم مواد
فراہم کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر افضل الدین اقبال کی تصنیف ان ہی دو کالجوں سے متعلق ملتی ہے۔

[1] فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج کا تنقیدی وتقابلی جائزہ از ڈاکٹر افضل الدین اقبال صفحہ ۱۲۸

فورٹ سینٹ جارج کالج و فورٹ ولیم کالج

فورٹ سینٹ جارج کالج

فورٹ سینٹ جارج کالج اور فورٹ ولیم کالج یہ دونوں بھی انگریزوں کے قائم کردہ کالج تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی۔ ابتداء میں اس کا مقصد صرف تجارت تھا لیکن آہستہ آہستہ ہندوستان کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اُٹھا کر اس نے تجارت کے ساتھ ساتھ حکومت کو بھی اپنے مقصد میں شامل کر لیا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز تک کمپنی کی بنیادیں مستحکم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ انگریزوں نے بڑی دانشمندی اور دور اندیشی سے اپنے ملازمین کو ہندوستانی زبانوں، رسم و رواج سے واقف کروانا ضروری سمجھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت جیسے جیسے مستحکم ہو رہی تھی انگلستان سے انگریز اس کمپنی میں ملازمت کے لئے ہندوستان کا رُخ کر رہے تھے۔ جو یقیناً ہندوستانی زبانوں سے بالکلیہ ناواقف تھے۔ کمپنی میں ملازمین کے لئے کئی عہدے ہوا کرتے، ان تمام عہدوں میں منشی کا عہدہ زیادہ اہم ہوتا چنانچہ ان منشیوں کی باقاعدہ تربیت کی جاتی جن کی عمریں لگ بھگ پندرہ تا اٹھارہ سال ہوتی۔ ان ہی منشیوں کی تربیت کے لئے مدراس کے انگریز گورنر جوزف کلکٹ نے ۱۷۱۷ء میں سینٹ جارج اسکول کے نام سے اس کی بنیاد ڈالی۔ تاریخ اُردو ادب میں رائٹرس کالج (Writers College) کے نام سے بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس نے آگے چل کر فورٹ سینٹ جارج کالج کے نام سے اپنی شناخت بنائی۔ اس کالج کے کئی شعبہ جات تھے مثلاً تعلیمی شعبہ، تصنیف و تالیف کے لئے ایک شعبہ اور کتب خانہ وغیرہ۔ تعلیمی شعبہ کے تحت تقریباً ہندوستانی مقامی زبانوں کی تعلیم کا انتظام تھا اور اس کے علاوہ قانون اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی چنانچہ یہاں صرف منشیوں کی ہی تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں بلکہ پیشہ وکالت سے تعلق

رکھنے والوں کے لئے بھی تعلیم کا خاصا انتظام تھا۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کے تحت انگریز حکام نے کئی ارباب فن کو ہندوستان کے مختلف حصوں سے دعوت دی۔ اس سلسلے میں منشی ابراہیم بیجاپوری کے علاوہ اور کچھ نام ملتے ہیں لیکن ابراہیم بیجاپوری کا نام اس لئے مشہور ہے کہ نہ صرف انھوں نے اس کالج میں خدمت انجام دینے کی ذمہ داری قبول کی بلکہ انوار سہیلی کا ترجمہ دکنی زبان میں کیا۔ حسن علی ماہلی اور عبدالودو عاشق کے علاوہ عبدالباقی کا شمار اس دور کے علماء اور فاضلوں میں ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مقامی علماء اور ادیبوں کو بھی کالج میں خدمات انجام دینے کا موقع دیا گیا۔ ان ادیبوں میں بھی بعض کا شمار اہل کمال میں ہوتا ہے۔ مہدی واصف کے متعلق کتابوں میں درج ہے کہ انھوں نے تقریباً تین سو کتابیں لکھی ہیں۔ منشی شمس الدین احمد، منشی مظفر اور غلام دستگیر کا شمار بھی اس کالج کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ مقامی اور غیر مقامی نام نہاد اساتذہ کے سبب ہندوستان کے گوشے گوشے میں فورٹ سینٹ جارج کالج کی شہرت ہوئی۔ اس کالج کے تحت صرف اُردو نثر کی تصانیف ہی منظر عام پر نہیں آئیں بلکہ ہندوستانی مقامی زبانوں اور تلگو اور ملیالم کی بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔

اس کالج میں تصنیف و تالیف کا شعبہ الگ قائم کیا گیا۔ جس کے تحت مختلف زبانوں میں کئی تصانیف منظر عام پر آئیں۔ ان تمام تصانیف کی اشاعت اس لئے بھی ممکن ہو سکی کہ کالج کا اپنا پریس موجود تھا۔ اس پریس سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ”ہندوستانی زبان کا تجزیہ اور اس کی قواعد و لغت“ ہے۔ جس میں دکھنی اور اُردو زبان کے الفاظ کا اچھا خاصہ سرمایہ ملتا ہے یہ ڈاکٹر ہنری کی لکھی ہوئی کتاب ہے بقول ڈاکٹر افضل الدین اقبال اسے گل کرسٹ کے کارنامے سے بہتر سمجھا جاتا ہے لیکن بہت کم دستیاب ہوتی ہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے کتب خانے میں جہاں ہندوستان کی دوسری زبانوں کی کتابیں ملتی ہیں وہیں دکنی زبان کی بھی بیشتر کتابیں ملتی ہیں۔ شیخ عین الدین گنج العلم، شمس العشاق اور شاہ میراں جی کی دکنی کتابیں بھی اس کتب خانے میں موجود ہیں۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے ہندوستانی مصنفین میں تراب علی نے اس طرح شہرت پائی کہ ۱۸۱۳ء میں یہ فورٹ سینٹ جارج کالج سے وابستہ ہوئے اور مدرس کی حیثیت سے اس کالج کے

خدمات انجام دینے لگے اور رفتہ رفتہ شعبۂ عربی، فارسی اور ہندوستانی یعنی اُردو کے صدر کی ذمہ داری قبول کرلی۔ اپنی صلاحیت وقابلیت کے سبب حکام کے دل میں جگہ بنالی۔ کالج کی باوقار شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور کالج کے اساتذہ میں شہرۂ آفاق شخصیتوں میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کی اُردو ادبی خدمات قابل ذکر ہیں۔ اُردو نثر کی داستانوں میں دکنی انوار سہیلی، حکایات الجلیلہ، سنگھاسن بتیسی کی کافی اہمیت ہے۔

منشی محمد ابراہیم بیجاپوری

دکنی انوار سہیلی ابراہیم بیجاپوری کی تصنیف ہے اس کی شہرت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا۔ ابراہیم بیجاپوری کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ ابراہیم بیجاپور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابراہیم بیجاپور سے مدراس کب آئے اور پتہ نہیں یہ کالج سے کب تک وابستہ رہے۔ ایک انگریز سردار کی درخواست پر فارسی انوار سہیلی کو دکنی میں لکھا۔ انگریز سردار ٹامس ہنری مونک جس کی فرمائش پر ابراہیم نے یہ کتاب لکھی۔ اس کے الفاظ اس تصنیف سے متعلق اس طرح ملتے ہیں :

> ''اس امر شائستہ وکار بائستہ سے سروران ذی شان وحاکمانِ زمان کی خدمت میں باعث نام آوری ہوگی اور دکنی زبان بھی از سرنو زندگی پاویگی''۔ [1]

ابراہیم بیجاپوری نہ صرف ادیب بلکہ شاعر بھی تھے۔ ابراہیم نے انگریز سردار کی شان میں کچھ اشعار لکھے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اشعار بالترتیب سردار کے نام کے حروف سے شروع ہوتے ہیں نام کے حروف کل ۱۲ ہیں لہذا اشعار کی تعداد بھی بارہ ہے۔

دکنی انوار سہیلی میں اخلاقی نصیحتوں اور حکومت کے رموز کو حکایتوں یا کہانیوں کے انداز میں پیش کیا ہے پہلے اس کتاب کا نام ''دکن انجن'' رکھا گیا لیکن اس نام سے شائد ہی کچھ لوگ واقف ہیں فارسی میں انوار سہیلی کافی مقبول ہے اسی لئے دکنی میں ترجمہ ہونے کے بعد دکنی انوار سہیلی کے نام سے ہی یہ زیادہ شہرت پائی۔ یہ تصنیف خود سینٹ جارج کالج کے پریس سے ہی شائع ہوئی۔ پروفیسر گیان

---

[1] فورٹ ولیم کالج اور فورٹ سینٹ جارج کالج ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال صفحہ ۱۳۰ تقابلی وتنقیدی جائزہ

چند جین دکنی انوار سہیلی سے متعلق رقم طراز ہیں :

''پنچ تنتر دُنیا کی بڑی کتابوں میں سے ہے۔مختلف زبانوں میں جتنے ترجمے اس کے ہوئے ہیں اتنے غالباً کسی کتاب کے نہیں ہوئے۔ یہی ''انوار سہیلی'' کی اصل ہے''۔[1]

پنچ تنتر سے متعلق ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں کہ اس کا مصنف وشنو شرما ہے یہ ۲۰۰ء ق م میں کشمیر میں لکھا گیا۔

اسی پنچ تنتر کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔عربی زبان میں اس کا ترجمہ ''حکایتِ کلیلہ ودمنہ'' کے نام سے ہوا۔اس کا مترجم عبداللہ ابن المقفع ہے۔عربی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد جتنے بھی ترجمے ہوئے وہ اسی عربی ترجمے کو دیکھ کر کیے گئے۔فارسی زبان میں اس کا ترجمہ نظم اور نثر دونوں میں کیا گیا۔فارسی انوار سہیلی مولانا حسین واعظ کاشفی کا کارنامہ ہے جس نے ۱۵۰۵ء میں وفات پائی۔

ڈاکٹر افضل الدین اقبال دکنی انوار سہیلی کو لسانی اعتبار سے اہم تصنیف بتاتے ہیں جو ۱۸۲۴ء میں شائع ہوئی۔زبان صرف ونحو اور فرہنگ کے اعتبار سے سبرس کے بعد اسی کا مرتبہ ہے۔اگرچیکہ یہ انیسویں صدی کی تصنیف ہے لیکن اس کے باوجود اس کا انداز قدامت لئے ہوئے ہے دکنی انوار سہیلی اگرچیکہ ترجمہ ہے لیکن محمد ابراہیم بیجاپوری نے اس پر اتنی محنت کی ہے اور اسے اتنا وقت دیا ہے کہ وہ ترجمے کے بجائے تالیف لگتی ہے۔

منشی شمس الدین احمد

داستان الف لیلیٰ یہ داستانوں میں ایک شہرت یافتہ داستان ہے۔منشی شمس الدین احمد قصبہ سعادت بند کے رہنے والے تھے۔آرکاٹ کے رئیس نواب سعادت اللہ خاں چوں کہ اس قصبے میں رہتے تھے لہٰذا اس کا نام قصبہ سعادت بند پڑ گیا۔اس قصبہ کی شہرت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہاں صحابی رسول حضرت تمیم انصاری کا مزار ہے۔لوگ دور دور سے اس مزار کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔منشی شمس الدین کی ابتدائی تعلیم وتربیت بھی یہیں ہوئی۔اُردو اور فارسی کے علاوہ شمس الدین نے

---

[1] اُردو کی نثری داستانیں گیان چند جین صفحہ ۱۳

انگریزی بھی سیکھی اور اس میں مہارت پیدا کی ۔ بقول ڈاکٹر افضل الدین اقبال فورٹ سینٹ جارج کالج کے تحت جب انھوں نے داستان الف لیلیٰ کا ترجمہ کیا تو اس وقت ان کی ملازمت تیس سال ہو چکی تھی ۔اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ یہ کمسنی میں ہی اس کالج سے وابستہ ہو چکے تھے ۔یعنی درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے ۔ان کی کتاب کی پہلی جلد ۱۸۳۶ء میں منظر عام پر آچکی تھی ۔

داستانِ الف لیلیٰ میں عرب ممالک ، بغداد ، شام ، مصر ، بصرہ وغیرہ کی تہذیب ومعاشرت کی تصاویر پیش کی گئی ہیں ۔

داستانِ الف لیلۃ ولیلہ کا ترجمہ شمس الدین نے دو جلدوں میں کیا ہے ۔ پہلی جلد میں سو (۱۰۰) راتوں کا اور دوسری جلد میں سو (۱۰۰) راتوں کا ترجمہ کیا گیا ہے ۔ جو بالترتیب ۱۸۳۶ء اور ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئیں ، اس کا نام " حکایاتِ الجلیلہ " رکھا ۔عربی زبان کی الف لیلۃ ولیلہ شیخ احمد بن محمود کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو ۱۸۱۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی ۔ شمس الدین کا ترجمہ حکایاتِ الجلیلہ اس قدر مقبول ہوا کہ کالج کے نصاب میں اسے شامل کیا گیا ۔

داستانِ الف لیلیٰ اس قدر دلچسپ داستان ہے کہ کئی مترجمین نے اپنے اپنے انداز سے یکے بعد دیگرے اس کا ترجمہ کیا ۔ان ترجمہ نگاروں میں شمالی ہند کے رجب علی بیگ سرور بھی شامل ہیں ۔ ہاشم بیجاپوری کی طرح شمس الدین نے بھی انگریز سردار جان اسٹوکس کی فرمائش پر یہ کتاب ترجمہ کی تھی ۔ جسے انگریز سرداروں نے کافی پسند کیا اور بقیہ راتوں کی داستان کا ترجمہ کرنے کی بھی فرمائش کی حسبِ فرمائش شمس الدین نے بقیہ (۹۰۱) راتوں کی داستان کا ترجمہ کرنے کا ارادہ تو کیا لیکن عربی الف لیلیٰ کے دستیاب نہ ہونے پر وہ اس کا ترجمہ نہ کر سکے ۔ جلد اول اور دوم میں صرف سو (۱۰۰) راتوں کی داستان کا ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ضخامت پانچ سو اور چار سو صفحات ہے ۔اتنے طویل قصوں میں ترجمہ نگار کا اندازِ بیان اس قدر دلچسپ ہے کہ قاری اس کو پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ اس میں ڈوب کر اس کا مطالعہ کرتا ہے ۔

دکنی سنگھاسن بتیسی

فورٹ سینٹ جارج کالج کے تحت ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں دکنی سنگھاسن بتیسی کا نام بھی ملتا

ہے چوں کہ اس میں کل بتیس کہانیاں ملتی ہیں لہٰذا اس کا نام سنگھاسن بتیسی رکھا گیا۔ لیکن اس کے مترجم کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے دو نسخے ادارہ ادبیات اُردو اور سالار جنگ لائبریری میں ملتے ہیں۔ سنگھاسن بتیسی ہندی نام ہے سنگھاسن کے معنی تخت شاہی ہے جس پر بادشاہ یا راجہ بیٹھ کر حکومت چلاتا ہے۔ اس میں راجہ بکر ماجیت کے جانشین راجہ بھوج کی تخت نشینی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ دربار کی بتیس پتلیاں راجہ بھوج کو قصہ سناتی ہیں۔ سنسکرت سے ترجمہ کی گئی کہانی ہے اور آگے چل کر اس قصے کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا۔ نہ صرف فورٹ سینٹ جارج کالج کے تحت اس کا ترجمہ ہوا بلکہ فورٹ ولیم کالج کے تحت بھی اس کا ترجمہ ہوا۔ لیکن اس کالج کے تحت ہندی زبان میں اس کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں ہوا۔

یہ کالج ۱۸۵۴ء تک باقی رہا یعنی ۱۳۷ سال اس کالج نے اُردو زبان اور ادب کی خدمت کی۔ بالخصوص دکنی ادب کے ترویج وارتقاء میں اس کالج نے اہم کردار ادا کیا۔

فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ءتا۱۸۵۴ء

اُردو نثر کی ترقی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبانوں سے واقف کروانے اور تعلیم وتربیت دینے کی غرض سے قائم کیا جانے والا دوسرا کالج فورٹ ولیم کالج ہے۔جو ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں قائم کیا گیا۔انگریزوں نے جہاں ایک عرصہ دراز تک ہندوستانیوں کو اپنا محکوم بنائے رکھا۔وہیں اُردو زبان وادب کو بھی مالا مال کردیا۔یہ اور بات ہے کہ انگریزوں کا مقصد خود اپنی کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبانوں سے واقف کروانا تھا جس کے دوش بہ دوش اُردو زبان کے پروان چڑھنے کی راہیں بھی ہموار ہوئیں۔۱۹ویں صدی کے اوائل میں کلکتہ اُردو ادب کا مرکز قرار پایا۔فورٹ ولیم کالج لارڈ ویلزلی کے عہد میں قائم ہوا۔اس کالج کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر جان گل کرسٹ تھے جو ہندوستانی شعبہ کے صدر تھے۔اُردو کے اچھے انشاء پردازوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔یہی سبب ہے کہ ان کی سرپرستی میں یہ شعبہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔اس کالج کا قیام لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی جہد پیہم کا نتیجہ تھا۔کیوں کہ کمپنی کے دوسرے عہدہ دار اس کالج کے قیام کی مخالفت کررہے تھے۔ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے بے انتہا دانشمندی سے کام لیتے ہوئے سارے ہندوستان کے مشہور ومعروف ادیبوں اور اہل قلم حضرات کو کلکتہ مدعو کیا تاکہ وہ فورٹ ولیم کالج کے تحت اپنی خدمات انجام دیں۔اس کالج کے تحت صرف اُردو کی کتابیں ہی منظر عام پر نہیں آئیں بلکہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں بھی کئی کتابیں لکھی گئیں۔گل کرسٹ کی فرمائش پر مصنفین نے اپنی جو تصانیف پیش کیں ان میں زیادہ تر تو ان کی اپنی تخلیقات نہیں تھیں بلکہ دوسری زبانوں عربی، فارسی اور سنسکرت سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں جن میں عام طور پر قصوں اور کہانیوں کی کتابیں تھیں۔ان کا آسان اُردو میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

گل کرسٹ نے یہی مناسب سمجھا کہ نئی تخلیقات پیش کرنے کے بجائے موجودہ تخلیقات کا ہی آسان اُردو میں ترجمہ کیا جائے۔ فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی شعبہ کے علاوہ کئی شعبۂ جات تھے چنانچہ زبانوں کے علاوہ تاریخ جغرافیہ اور قانون کی کتابوں کا بھی اُردو زبان میں ترجمہ کروایا گیا۔ کیوں کہ لارڈ ویلزلی اور گل کرسٹ دونوں کی خواہش یہی تھی کہ کمپنی کے ملازمین کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام ہو تاکہ کمپنی کے قیام کا مقصد تکمیل پا جائے۔

گل کرسٹ نے اہل قلم حضرات سے فرمائش کی کہ وہ زبان کو تکلفات سے دور رکھتے ہوئے روزمرہ کی زبان کا استعمال کریں چنانچہ اس کالج کے تحت جتنی بھی تصانیف منظر عام پر آئیں ان میں عبارت آرائی، مقفی اور مسجع عبارت سے گریز کیا گیا۔ صاف اور سلیس عبارت اُردو میں رواج پائی۔ اس کالج کے تحت بے شمار مصنفین کے نام ملتے ہیں۔ ان میں قابل ذکر اہل قلم کے نام اس طرح ہیں۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ، میر امنؔ، شیر علی افسوسؔ، حیدر بخش حیدریؔ، نہال چند لاہوری، مرزا کاظم علی جوان، مظہر علی خاں ولاؔ، مرزا علی لطفؔ، للولال جی، بنی نرائن جہاںؔ وغیرہ۔

متذکرہ اہل قلم حضرات کلکتہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ملک کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتے تھے ان میں زیادہ تر دلی والے تھے۔ گل کرسٹ کی شہرت اور فیاضی نے انھیں ان کی دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ کیا اور وہ کلکتہ آ گئے۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کی طرح اس کالج میں بھی تصنیف و تالیف کا شعبہ اور کتب خانہ موجود تھا۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ ۱۷۵۹ء-۱۸۴۱ء

ڈاکٹر جان گل کرسٹ صدر شعبۂ ہندوستانی اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے بحیثیت ملازم وابستہ ہوئے۔ بارہ سال کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے انھیں اچھا تجربہ ہو چکا تھا اور کمپنی کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے انھوں نے مناسب ترین راستہ اختیار کیا۔ فورٹ ولیم کالج کی مشہور زمانہ تصنیف ''باغ و بہار'' بے انتہا سادہ اور مؤثر انداز میں انھیں کی فرمائش پر لکھی گئی۔ لیکن گل کرسٹ صرف ۱۸۰۴ء تک یعنی فورٹ ولیم کالج کی عمر ابھی چار سال ہی تھی کہ وہ پنشن لے کر اپنے وطن واپس ہو گئے۔ ۱۸۱۸ء میں گل کرسٹ لندن کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ

سے وابستہ ہوئے۔ اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے وہاں خدمات انجام دیں۔ ان کی کئی تصانیف کے نام ملتے ہیں ان میں انگریزی ہندوستانی ڈکشنری، ہندوستانی گرامر اور اورینٹل لنگوسٹ بہت مشہور ہوئیں۔

میر امن دہلوی

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں مایہ ناز شہرت حاصل کرنے والی شخصیت میر امن دہلوی کی ہے۔ جس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آباو اجداد کو مغلیہ حکومت کی جانب سے جاگیریں بھی ملیں تھیں۔ دلی کی تباہی و بربادی میں جب لوگوں نے دلی کو خیر باد کہا تو میر امن نے بھی پٹنہ کا رُخ کیا اور پٹنہ سے کلکتہ آئے اور فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے اس کی تفصیل اس طرح ملتی ہے کہ کلکتہ میں میر امن نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اسی دوران ان کی ملاقات میر بہادر علی حسینی سے ہوئی۔ بہادر علی میر امن کی شخصیت سے متاثر ہوئے اور ڈاکٹر گل کرسٹ سے انھیں ملایا اس طرح میر امن فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے اور تین سال تک اس کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں خدمات انجام دیتے رہے۔ اس اثناء میں انھوں نے دو کتابیں لکھیں۔ جس کے نام ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' ہیں۔

''باغ و بہار'' کچھ محققین کے کہنے کے مطابق امیر خسرو کی تصنیف چہار درویش کا ترجمہ ہے اور کچھ محققین کے مطابق عطا حسین تحسین کی تصنیف ''نوطرز مرصع'' کا اُردو ترجمہ ہے اس میں چہار درویش کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ قصہ ٹھیٹ ہندوستانی زبان میں لکھا گیا ہے جسے سارے ہندوستانی بولتے اور سمجھتے ہوں۔ باغ و بہار ایک تاریخی نام ہے۔ ۱۸۰۱ء میں میر امن نے اسے لکھنے کا آغاز کیا اور ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۳ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اسی مناسبت سے اس کا نام ''باغ و بہار'' رکھا گیا

ب	ا	غ	و	ب	ہ	ا	ر		
۲	۱	۱۰۰۰	۶	۲	۵	۱	۲۰۰	=	۱۲۱۷ھ

باغ و بہار کی تحریر کا زمانہ وہ تھا جب کہ فارسی زبان اُردو زبان پر غالب تھی کیوں کہ مغلوں

کے قدم ہندوستان میں جمے ہوئے کافی طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ چنانچہ فارسی زبان کو ہندوستان کی سرکاری، کاروباری، دفتری اور ادبی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اس دور میں لوگ اُردو زبان میں تحریر کرنا عیب سمجھتے تھے۔ ایسے دور میں میرامن نے بے انتہا سلاست اور سادہ طرزِ بیان اپنا کر فارسی کی چہار درویش کا ترجمہ اُردو زبان میں کرتے ہوئے لازوال شہرت حاصل کرلی۔ ان کی لازوال شہرت کے لئے ان کی پہلی تصنیف ''باغ و بہار'' ہی کافی ہے۔ یہ نہ صرف میرامن کی لازوال شہرت کا سبب بنی بلکہ فورٹ ولیم کالج کے تحت لکھی جانے والی کتابوں میں سرفہرست رہی۔ دلی کی ٹکسالی زبان میں لکھی ہوئی کتاب جس کی سلاست، روانی، محاورے اور لطافت اپنا جواب نہیں رکھتی۔ یہ چار درویشوں کی آپ بیتی ہے جن کا ماضی بے انتہا شاندار تھا لیکن انقلابِ زمانہ اور گردشِ زمانہ کے سبب یہ درویش بن گئے۔ جب یہ سارے ایک مقام پر اتفاقاً جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو اپنی آپ بیتی سناتے ہیں۔ جسے میرامن نے بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے ابتداء میں باغ و بہار کو وہ اہمیت نہ ملی لیکن رفتہ رفتہ جب آسان اور عام فہم اُردو لکھنے کا رواج ہوا تو اس کی اہمیت اور شہرت بڑھتی گئی۔ آج بھی جب کہ اس تصنیف کو لکھے ہوئے دوسو سال کا عرصہ گذر چکا ہے اس کی اتنی ہی اہمیت ہے۔

میرامن کی دوسری تصنیف ''گنج خوبی'' ہے۔ گنج خوبی کے حصے میں وہ شہرت نہ آئی جو باغ و بہار کو ملی تھی۔ لہٰذا یہ تصنیف گمنام ہی رہی اس کا نام ''گنج خوبی'' ہونے کے باوجود قارئین کو اس میں وہ خوبیاں نظر نہ آئیں جو باغ و بہار میں موجود تھیں۔ ''گنج خوبی'' فارسی زبان کی مشہور تصنیف اخلاقِ محسنی کا ترجمہ ہے۔

میر شیر علی افسوسؔ ۱۷۳۵ء-۱۸۰۹ء

میر شیر علی افسوسؔ دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک عرصہ بعد افسوسؔ کے والد میر مظفر علی خاں پٹنہ چلے گئے اور افسوسؔ ان کے ہمراہ پٹنہ آئے اور پھر اپنے والد کے ہمراہ پٹنہ سے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ ۱۸ ویں صدی کے نصف دوم میں لکھنؤ میں شاعری اپنے عروج پر تھی۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران شیر علی افسوسؔ نے انگریز کرنل کے آگے اپنا خاص مقام بنالیا۔ آصف الدولہ کے ذریعہ ان کی ملاقات اس کرنل سے ہوئی تھی۔ کرنل نے دوسو روپے ماہوار پر انھیں کلکتہ بھیجا اور زادِ راہ کے بھی اخراجات

برداشت کئے۔ میر شیر علی افسوؔس کلکتہ پہنچ کر فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہوئے اور کئی تصانیف کا انھوں نے ترجمہ کیا۔

گلستانِ سعدی کا افسوؔس نے نہایت آسان اُردو زبان میں ''باغ اُردو'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ افسوؔس کی دوسری کتاب ''آرائش محفل'' ہے جس میں انھوں نے ملک کے تاریخی حالات پر مشتمل کتاب خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ کیا ہے۔ لیکن یہ حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل سے جداگانہ انداز پر مشتمل ہے۔ افسوس نہ صرف ادیب تھے بلکہ صاحب دیوان شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سوؔدا کے کلیات کو بعد از تصحیح انھوں نے دوبارہ شائع کروایا۔

سید حیدر بخش حیدریؔ ۱۷۶۸ء-۱۸۲۳ء

سید حیدر بخش نام اور حیدری تخلص کرتے تھے۔ ان کا آبائی وطن نجف اشرف تھا لیکن بعد ازاں جب ان کے والد نے دہلی بسائی تو حیدریؔ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن معاشی پریشانیوں سے گھبرا کر والد اپنے اہل و عیال کے ساتھ بنارس منتقل ہو گئے۔ حیدری کی پرورش بنارس میں ہوئی۔ بنارس میں قیام کے دوران حیدری نے کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے چرچے سنے تھے۔ بنارس میں دینی و دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ناظم عدالت نواب ابراہیم خاں خلیل نے عدالت میں انھیں اپنی ماتحتی میں لے لیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں حیدری کالج کے چرچے سن کر کلکتہ گئے اور قصہ ''مہر و ماہ'' جو انھوں نے بنارس کے قیام کے دوران لکھی تھی وہ انھوں نے ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی خدمت میں پیش کی جو انھیں بے حد پسند آئی۔ گل کرسٹ نے ان کا تقرر کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف میں کیا۔ کچھ عرصہ حیدری اس کالج سے وابستہ رہے۔ اس دوران ان کی لکھی ہوئی تصانیف کے نام اس طرح ملتے ہیں۔

طوطا کہانی، آرائش محفل، تذکرہ گلشن ہند کے علاوہ امیر خسرو کی مثنوی، لیلیٰ مجنوں کا اُردو ترجمہ اور ''تاریخ نادری'' وغیرہ۔ ایک یا دو تصانیف اور بھی ملتے ہیں جو زیورِ اشاعت سے آراستہ نہیں ہوئے۔

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی بھی دلی سے تعلق رکھتے تھے اور ایک خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے بہادر علی حسینی ہی فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے۔ اس خیال کو تقویت اس طرح ملتی ہے کہ میر امن کے سلسلے میں اکثر تصانیف میں یہی واقعہ ملتا ہے کہ انھوں نے بہادر علی حسینی کے توسط سے ہی ڈاکٹر گل کرسٹ سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ تاریخ اُردو ادب کی کتابوں میں بہادر علی حسینی کا تفصیلی تذکرہ نہیں ملتا۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت مصنف نے دو کتابیں لکھیں جن کے نام ''نثر بے نظیر'' اور ''اخلاق ہندی'' ہیں۔

''نثر بے نظیر'' میر حسن کی مشہور زمانہ مثنوی سحر البیان کا اُردو ترجمہ ہے جو نثر میں لکھا گیا ہے اس طرح یہ داستان بے نظیر کہلانے کی مستحق ہے۔

''اخلاق ہندی'' مصنف کی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں جو قصے بیان کئے گئے ہیں وہ سنسکرت کے اخلاقی قصوں پر مبنی ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی۔ ان دو کتابوں کے علاوہ ''تاریخ آسام'' بھی ان کی تیسری کتاب ہے۔ یہ بھی فارسی زبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بہادر علی حسینی نے گل کرسٹ کی لکھی ہوئی قواعد کو مختصر اور آسان اُردو میں لکھا۔ یہ کتاب بھی کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس طرح بہادر علی حسینی نے فورٹ ولیم کالج کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔

نہال چند لاہوری

نہال چند لاہوری اگرچہ دلی کے باشندے تھے لیکن کسی وجہ سے ایک عرصہ دراز تک لاہور میں مقیم رہنے کے سبب لاہوری کہلائے۔ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ آ کر فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے اور اس کالج کے تحت انھوں نے گل بکاولی جیسے مشہور زمانہ قصے کو اُردو زبان میں ترجمہ کر کے پیش کیا۔ یہ قصہ فارسی زبان میں موجود تھا جسے عزت اللہ بنگالی نے لکھا تھا نہال چند لاہوری نے اس کے اُردو ترجمے کا نام ''مذہب عشق'' رکھا۔ ۱۸۰۴ء میں یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کی شہرت کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کئی مرتبہ مختلف مقامات سے شائع ہوتی رہی۔ یہی قصہ تھا جسے پنڈت دیا شنکر نسیم نے بھی اپنی مثنوی میں بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ جو دبستان لکھنؤ کی مشہور و معروف

مثنوی کہلائی۔ اس سے یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قصہ گل بکاولی سارے ہندوستان میں شہرت پا چکا تھا۔

نہال چند لاہوری کا قصہ یا ان کی کتاب مذہب عشق ۱۸۱۲ء میں شائع ہوئی۔

مرزا کاظم علی جوان

مرزا کاظم علی جوان بھی دلی کے رہنے والے تھے۔ لیکن دلی چھوڑ کر لکھنؤ میں آ بسے۔ ان کے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کا واقعہ اس طرح درج ہے کہ وہ شاعر بھی تھے۔ لکھنؤ سے انھوں نے اپنا کلام نواب علی ابراہیم خاں خلیلؔ (جس کا ذکر حیدر بخش حیدری کے سلسلے میں ہو چکا ہے) کو بھیجا کیوں کہ وہ بھی شاعر تھے۔ خلیلؔ ان کے کلام کو پڑھ کر ان کی صلاحیت سے متاثر ہوئے کرنل اسکاٹ نے ۱۸۰۰ء میں انھیں کالج کے لئے منتخب کیا۔ کاظم علی جوان لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ آئے۔ یہاں تین تصانیف ان کے نام سے ملتی ہیں۔ ''شکنتلا'' کالی داس کا مشہور ڈرامہ جسے کالی داس نے سنسکرت میں لکھا تھا، سنسکرت زبان سے یہ برج بھاشا میں لکھا گیا۔ کاظم علی نے اسے برج بھاشا سے اُردو میں منتقل کیا۔ یہ اُردو نثر میں لکھا گیا۔

''بارہ ماسہ'' اس میں ہندوستانیوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کو پیش کیا گیا ہے جو سال کے بارہ مہینوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی فصلوں کا بھی اس میں تذکرہ ملتا ہے۔ ترجمہ ''تاریخ فرشتہ'' یہ بہمنی خاندان کی تاریخ ہے جسے جوان نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ''سنگھاسن بتیسی'' بھی ان کی کتاب ہے جسے انھوں نے گجرات کے للولال کی مدد سے لکھا ہے۔ جو فورٹ ولیم کالج سے وابستہ تھے۔ ''خرد افروز'' جو مولوی حفیظ الدین کی کتاب تھی اس پر نظر ثانی کرنے کے علاوہ جوان نے قرآن مجید کے اُردو ترجمے کی بھی تصحیح کی۔ اس طرح کاظم علی جوان نے فورٹ ولیم کالج کے تحت ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر کئی تصانیف لکھیں۔

مظہر علی خاں ولاؔ

ان کا نام مرزا علی لطف تھا۔ لیکن مظہر علی خاں ولاؔ کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا اصل وطن دلی تھا یہ اُردو، ہندی اور فارسی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ مصحفیؔ کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا

ہے۔فورٹ ولیم کالج کے تحت انھوں نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔جن کے نام اس طرح ملتے ہیں ''مادھونل اور کام کنڈلا'' ہندی سے ترجمہ کی گئی کتاب ''ہفت گلشن'' ناصر علی خاں کی لکھی ہوئی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔''بیتال پچیسی'' ان کی مشہور کتاب ہے جس میں کل ۲۵ کہانیاں ملتی ہے یہ سنسکرت میں لکھی گئیں تھیں۔سنسکرت سے اس کا ترجمہ برج بھاشا میں ہوا اور مظہر علی خاں ولاؔ نے اس کا ترجمہ اُردو زبان میں کیا۔''تاریخ شیر شاہی'' جو فارسی میں لکھی ہوئی تھی اس کا ترجمہ انھوں نے اُردو زبان میں کیا۔۱۸۰۵ء تک انھوں نے ان کتابوں کو اُردو میں پیش کر دیا۔

مرزا علی لطف ۱۷۵۴ء-۱۸۱۸ء

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے والے زیادہ سے زیادہ مصنفین دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ علی لطف بھی دلی کے رہنے والے تھے۔عظیم الحق جنیدی کی تاریخ کے مطابق لطف ۱۷۴۱ء میں نادرشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے صفدر جنگ کی لطف ومہربانی سے ان کی رسائی دربار شاہی میں ہوئی۔کہا جاتا ہے کہ لطف دکن جانا چاہتے تھے لیکن گل کرسٹ نے انھیں روک لیا۔''گلشن ہند'' لطف کی تصنیف ہے جو تذکرہ گلزار ابراہیم (ابراہیم خاں خلیل) کا ترجمہ ہے۔۱۸۰۱ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔لطف نے اس میں حذف و اضافہ کیا ہے۔یہ ابتداء میں بہت کم دستیاب تھا لیکن ۱۹۰۸ء میں جب موسیٰ ندی میں طغیانی آئی تو اس کی ایک جلد پانی پر تیرتے ہوئے کسی کے ہاتھ لگ گئی۔انجمن ترقی اُردو نے اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا۔اس طرح یہ منظر عام پر آئی۔انجمن ترقی اُردو کی وہ شخصیت جس کے سبب یہ تصنیف منظر عام پر آئی مولوی عبدالحق ہیں۔

للولال جی

للولال جی گجرات کے برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔فورٹ ولیم کالج میں بحیثیت منشی ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ ہندی زبان سے اُردو میں ترجمہ ہونے والی کتابوں کے مصنفین کی نہ صرف مدد کریں بلکہ ہندی زبان میں بھی کتابیں لکھیں۔''سنگھاسن بتیسی'' جو اُردو میں لکھی گئی وہ ان کا اور مرزا کاظم علی جوان کا کارنامہ ہے۔اس کے علاوہ راج نیتی اور پریم ساگر نامی تصانیف انھوں نے ہندی میں لکھی ہیں۔

بینی نارائن

بینی نارائن کا نام بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں لیا جاتا ہے۔ یہ لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاںؔ ان کا تخلص تھا۔ انھوں نے اپنی تصنیف ''چہار گلشن'' میں ایک فارسی قصے کا ترجمہ کیا ہے۔ ''جہاں اُردو'' تذکرے کے مؤلف بھی ہیں جو اُردو شعراء کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ فورٹ ولیم کالج میں کافی پسند کیا گیا اور مصنف کو معقول انعام سے نوازا گیا۔ شاہ رفیع الدین کی کتاب ''تنبیہ الغافلین'' کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا۔ مندرجہ بالا مصنفین کے علاوہ مولوی اکرام علی، مولوی امانت اللہ، مرزا جان طپش، سید حمید الدین بہاری اور مرزا محمد فطرت کا شمار بھی فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں ہوتا ہے جن کی ایک ایک تصنیف تو ضرور ملتی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام دراصل سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے عمل میں آیا تھا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے ذریعہ اُردو ادب کی بڑی تیزی سے ترقی ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ اُردو ادب کے ضمن میں فورٹ ولیم کالج کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فورٹ ولیم کالج اُردو ادب کے ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمپنی کے انگریز حکام چوں کہ کمپنی کے انگریز ملازمین کو جلد از جلد ہندوستانی زبان و ادب سے واقف کروانا چاہتے تھے اور اس ضمن میں انھوں نے ہر ممکنہ کوشش کی۔

☆☆☆

تیسرا باب

فورٹ ولیم کالج سے باہر اُردو نثر کی ترقی

فورٹ ولیم کالج میں چوں کہ ملک کے مختلف حصوں سے اہل قلم اور ادیب جمع ہوئے تھے اور فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا کام بڑے زور و شور سے انجام پا رہا تھا۔ یہی سبب ہے کہ سارے ہندوستان میں اس کے چرچے ہونے لگے۔ شمالی ہند میں کئی نثر نگار اُبھرے جنھوں نے اُردو نثر تحریر کی لیکن ان کی تحریروں میں وہ سادگی، سلاست اور روانی کم ہی ہوتی جو فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کی تحریروں میں ہوتی۔ عظیم الحق جنیدی کی تصنیف اُردو ادب کی تاریخ کے مطابق اس دور میں لکھی جانے والی کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

مولوی کریم الدین نے ''تاریخ ابی الفداء'' کا عربی زبان سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

مولوی محمد صفا نے ''زادِ آخرت'' تحریر کی، اس سے قبل مولوی حافظ احمد نے سراج ایمان لکھی حافظ علی نے راہِ نجات لکھی جس نے کافی شہرت پائی۔

مولوی حیات نے سراج الحیات کے نام سے ایک تصنیف لکھی۔

مولوی عبدالقادر نے گلشن دین کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

مندرجہ بالا کتابوں کے عنوان اور مصنفین کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ساری تصانیف مذہبی موضوع پر لکھی گئیں ہیں جو ابتدائی دور میں صوفیائے کرام کی لکھی دکنی زبان کی کتابوں کے برعکس اُردو زبان میں لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ اسی زمانے میں محمد خالق اکبرآبادی نے مخزن القواعد لکھی جو ۱۸۱۳ء میں منظر عام پر آئی۔ مولوی ولی محمد کی میخانۂ وحدت بھی اسی دور کی تصنیف ہے۔ مولوی قادر بخش پانی پتی نے اسی عرصے میں مختصر القواعد بھی تصنیف کی۔ یہ تمام تصانیف ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۶ء تک فورٹ ولیم کالج کے باہر لکھی گئیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور مصنفین کے نام ملتے ہیں محمد

حسین کلیم نے خصوص الحکم (تصوف کی کتاب) کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ مہر چند، مہجور، حکیم محمد شریف اور بندرابن کے علاوہ مرزا ہاشم علی خاں، افتخار الدین شہرتؔ، مرزا قاسم علی ممتازؔ، سید جعفر علی رواںؔ، میر عبداللہ مسکین، مولوی خلیل اشکؔ اور رشکؔ کے نام اس دور کے مصنفین میں ممتاز ہیں۔ رشک نے ۱۸۰۸ء میں اکبر نامہ کا ترجمہ ''واقعات اکبر'' کے نام سے کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شائد اور کئی مصنفین ہوں گے جنھوں نے اُردو نثر میں کئی اور کتابیں لکھی ہوں گی لیکن پریس کے نہ ہونے کے سبب ان کی تصانیف تلف ہو گئیں۔ مندرجہ بالا مصنفین جن کے نام گنوائے گئے ہیں ان کا تذکرہ صرف احتشام حسین اور عظیم الحق جنیدی کی تصانیف میں ہی ملتا ہے۔

عیسائی ادیبوں کے کارنامے

اُردو نثر کا جب ایک مرتبہ آغاز ہو چکا تو اس کی مسلسل ترقی ہوتی رہی۔ اس کی ترقی میں ہندوستانی ادیبوں اور مترجمین کے ساتھ ساتھ عیسائیوں نے اس طرح حصہ لیا کہ ان کی مقدس کتاب ''انجیل'' کا بھی ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کروایا، ان ترجموں میں اُردو زبان کے ترجموں کی تعداد قابل لحاظ تھی کیوں کہ اس دور میں اُردو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان تھی۔ عیسائی مبلغین نے یہ ترجمے اپنے مذہب کی تبلیغ کی غرض سے پیش کیے تھے۔ جس سے نثر کی ترقی بھی ممکن ہو سکی۔

قرآن مجید کے ترجمے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند شاہ رفیع الدین نے سب سے پہلے ۱۸ ویں صدی عیسوی کے آخر میں قرآن مجید کا اُردو میں ترجمہ کیا اور شاہ ولی اللہ کے اک اور فرزند عبدالقادر نے قرآن مجید کا بامحاورہ ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے علاوہ اور کچھ انگریز مصنفین نے بھی اُردو قواعد کی کتابیں کپتان جوزف ٹیلر، گلیڈون، کپتان ٹاس روبک، جان شیکسپیر، ولیم ٹیٹ، ایس ڈبلیو برٹین اور جیمس آر بالن ٹائن وغیرہ نے لغت اور قواعد کی کئی کتابیں لکھی جن میں سے کچھ تو کلکتہ ہی میں شائع ہوئیں اور کچھ لندن میں شائع ہوئیں۔

انشاءاللہ خاں انشاؔ ۱۷۵۲ء تا ۱۸۱۷ء

سید انشاء کا شمار اُردو ادب کے معروف شعراء اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے اجداد کا وطن نجف اشرف تھا خاندانی پیشہ طب تھا۔ اپنے پیشہ میں نہایت ممتاز تھے۔ اسی پیشے کے سبب دربار مغلیہ میں رسائی ہوئی۔ لیکن دہلی کی تباہی پر سید انشاء کے والد ماشاء اللہ مرشد آباد چلے گئے اور انشاء یہیں پیدا ہوئے۔ والد نے انشاء کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ دی۔ شاہ عالم ثانی کے دور میں یہ دہلی آئے۔ اپنی صلاحیت، بذلہ سنجی اور شگفتگی مزاج کے سبب یہ سارے دربار پر چھا گئے۔ شاعری کے چرچے تھے۔ شعراء میں معرکے ہوا کرتے۔ انشاء نے تقریباً معرکے سر کیے۔ لیکن بعد میں دہلی کے حالات سے مجبور ہو کر انھیں دہلی چھوڑنا پڑا اور انشاء نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ مشہور شعرائے دہلی سوزؔ، سوداؔ، جراءت اور مصحفی نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ لکھنؤ جا کر انشاء اور مصحفی نے اتنی شہرت پائی کہ تاریخ اُردو ادب کا ایک دور ہی انشاء اور مصحفی کے نام سے معنون ہو گیا۔

انشاء نے شاعر کے علاوہ ادیب کی حیثیت سے بھی کافی شہرت پائی۔ ان کے نثری تصانیف میں ''رانی کیتکی'' اور ''کنور ادے بھان'' کی کہانی زیادہ شہرت رکھتی ہے اور اس کے علاوہ ''دریائے لطافت'' جو قواعد و لسانیات پر مشتمل ہے مقبولیت کی حامل ہے۔ رانی کیتکی کی کہانی ۱۸۰۳ء لکھی گئی۔ اس کہانی سے متعلق بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق کا خیال ہے کہ مقفی اور مسجع عبارت کو نظم کے انداز میں یا نظم کی چاشنی دے کر اُردو زبان پر انشاء نے بڑا احسان کیا ہے۔ کیوں کہ اس میں عربی اور فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب کی اہمیت دوگنی ہو چکی ہے کہ ہندی والے اسے ہندی کتاب سمجھتے ہیں تو اُردو والے اسے اُردو کی کتاب سمجھتے ہیں۔ جابجا ظرافت نے کتاب کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے مرقع انشاء نے اپنی اس کتاب میں پیش کیے ہیں۔ منظر نگاری انشاء کے ہاں اتنی مؤثر ہوتی ہے کہ لوگوں کی نگاہوں کے آگے منظر آ جاتا ہے۔ اس کتاب کا ذکر ہندی کے نقاد بھی اپنی تنقیدوں میں کرتے ہیں۔ کھڑی بولی کو ترقی دینے والے ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انشاء کئی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کتاب میں صرف ایک ہی زبان کا استعمال کیا ہے۔

اُردو ادب میں سادہ نثر کی بنیاد رکھنے والوں میں مرزا غالب کا نام لیا جاتا ہے۔ اسی سادہ نگاری کی بناء مرزا غالب سے پہلے انھوں نے ڈالی تھی۔ انشاء کی یہ کہانی انھیں لافانی بنانے میں مددگار ومعاون ثابت ہوئی۔

فقیر محمد خاں گویاؔ ۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۹ء

گویاؔ چوں کہ لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے لکھنؤ میں اُردو زبان وادب کی اہمیت کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ لکھنؤ میں اُردو زبان کی ترقی کا باقاعدہ آغاز عہد آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) میں ہوا۔ آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم کو بھی اُردو زبان سے اتنا ہی لگاؤ تھا اور آصف الدولہ بھی زبان وادب سے کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی علم دوستی کے لکھنؤ میں چرچے تھے۔ گویاؔ کا عہد آصف الدولہ کے بعد کا تھا۔ اس وقت سارے لکھنؤ میں علم وادب کے چرچے تھے۔ گویا شاہی فوج کی سالاری کا شرف رکھتے تھے شاعری میں ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا نثری کارنامہ ''بستان حکمت''، جس میں گویاؔ نے انوار سہیلی کا ترجمہ کیا ہے جو اُردو زبان میں موجود ہے۔ انوار سہیلی کے ترجمہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ ایک مرتبہ گویا کے استاد ناسخ اور ان کے اصحاب کی محفل میں انوار سہیلی کی تعریف وتحسین کی جارہی تھی ان میں سے کسی نے کہا کہ انوار سہیلی کا ترجمہ اُردو زبان میں ہونا چاہئے لوگوں نے فقیر محمد خاں گویاؔ کو یہ ذمہ داری دی کہ وہ اس کا ترجمہ اُردو زبان میں کریں پس گویاؔ نے اس کا ترجمہ کیا۔ ترجمہ نگاری کے دوران گویاؔ نے اپنی ذہنی صلاحیت اور قابلیت کا پورا پورا استعمال کیا۔ حتیٰ الامکان کتاب کو دلچسپ بنانے کی پوری پوری کوشش کی۔ لیکن عربی وفارسی کے الفاظ کا زیادہ سے زیادہ استعمال اور صنائع بدائع کی کثرت کتاب کو کسی قدر بوجھل بنا دیتی ہے۔ یہ انداز تحریر سرورؔ کا بھی ہے۔ چوں کہ اس دور کے لوگ عربی وفارسی زبان سے اچھی طرح واقف تھے لہٰذا یہ کتاب بے حد مقبول نہ ہوئی تو بالکل غیر مقبول بھی نہ رہی۔ گویاؔ اپنی کتاب سے متعلق بہتر رائے رکھتے ہیں۔ جو ''بستان حکمت'' کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ بستان حکمت ۱۸۲۵ء کو مکمل ہوئی اور منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد گویاؔ اور پچیس سال بقید حیات رہے۔ لیکن ان کا کلام ان کی زندگی میں نہیں بلکہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا گویاؔ کا انتقال ۱۸۴۹ء یا ۱۸۵۰ء میں ہوا۔

رجب علی بیگ سرورؔ ۱۷۸۵ء-۱۸۶۹ء

سرورؔ کا شمار اُردو کے صاحب طرز انشاء پردازوں میں ہوتا ہے۔ فسانہ عجائب نہ صرف ان کی مایہ ناز تصنیف ہے بلکہ اُردو ادب کی مایہ ناز تصانیف میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اگر چیکہ شاعر بھی تھے اور واجد علی شاہ کے دربار سے بھی وابستہ تھے لیکن ان کی شہرت شاعری کے سبب نہیں بلکہ ''فسانہ عجائب'' کے سبب ہے۔ اگر چیکہ سرور کی دوسری تصانیف گلزار سرورؔ، انشائے سرورؔ، سرورِ سلطانی، سیر وعشق، شگوفہ محبت ہیں۔ ''انشائے سرورؔ'' میں سرور کے خطوط ملتے ہیں۔

ان کے علاوہ ''شبستان سرورؔ'' مصنف کی وہ کتاب ہے جس میں الف لیلیٰ کے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن فسانہ عجائب کا سرورؔ کی زندگی میں متعدد مرتبہ شائع ہونا اس کی مقبولیت کا غماز ہے۔ اگر چیکہ اس کا اندازِ تحریر قدامت لئے ہوئے ہے یعنی مقفّی و مسجع عبارت اسی انداز پر مشتمل اُردو نثر کی دو کتابیں اور بھی ملتی ہیں۔ فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' اور عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصع''۔ ''کربل کتھا'' وہ تصنیف ہے جسے کسی زمانے میں اُردو نثر کی پہلی تصنیف کی حیثیت حاصل تھی۔ سرور کی تصنیف ''فسانہ عجائب'' شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے ان دونوں تصانیف سے آگے ہے۔ تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ موزوں اور غیر موزوں دونوں طرح کی ملتی ہے۔ تشبیہ اور استعارات کا استعمال ناموزوں نہیں ساتھ ہی محاکات نگاری بھی ملتی ہے۔ علاوہ ازیں آیات قرآنی اور اشعار کا برموقع اور برجستہ استعمال اسے اور بھی دلچسپ بنا دیتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فسانہ عجائب قدیم طرز پر مشتمل ہے لیکن اس کے باوجود کردار، پلاٹ، مکالمے اور جذبات نگاری سے یہ کتاب لیس ہے۔ چنانچہ اس کتاب سے متعلق نقادوں کی رائے یہی ہے کہ یہ تصنیف داستان گوئی کا اختتام اور ناول نگاری کا آغاز ہے۔ گویا داستان اور ناول کا سنگ میل قرار پاتی ہے۔ چنانچہ فسانہ عجائب کے مطالعے کے وقت داستان اور ناول کے فرق کو ذہن میں رکھتے ہوئے تجزیہ کیا جائے تو بہ آسانی اس کی حیثیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ سرور لکھنؤ کی تہذیب کو دل سے پسند کرتے تھے۔ ساتھ ساتھ حقیقت پسند بھی تھے۔ مبالغہ کو صرف اس حد تک گوارا کرتے تھے کہ ادب میں مبالغہ کی گنجائش تھی۔

مرزا غالبؔ ۱۷۹۶ء تا ۱۸۶۹ء

اُردو شاعری میں جس طرح مرزا غالبؔ کا نام شہرت کی بلندی پر ہے اسی طرح اُردو نثر کے سلسلے میں بھی ان کا نام کم اہمیت کا حامل نہیں۔ لیکن نظم اور نثر دونوں کا انداز جداگانہ ہے۔ مرزا غالبؔ نے جہاں شاعری میں مشکل پسندی کو اپنایا ہے وہیں نثر کے میدان میں سادگی، عام فہمی، سلاست اور روزمرہ سے ایسا کام لیا ہے کہ اُردو ادب کے نقادوں نے لکھ دیا کہ عہدِ جدید میں جب سرسید احمد خاں نے سادہ نثر نگاری کا آغاز کیا تو ان کے آگے مرزا غالبؔ کے خطوط موجود تھے۔ اُردو نثر نگاری میں مرزا غالبؔ کے خطوط ہی انہیں نثر نگار اور ادیب کا مقام دلواتے ہیں۔ ان خطوط کے علاوہ اُردو نثر نگاری میں کوئی اور صنف مرزا کے ہاں نہیں ملتی۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ ان کی مکتوب نگاری اور ان کے خطوط کے سبب مکتوب نگاری اُردو نثر کی ایک صنف قرار پائی۔ مرزا غالبؔ سے صنف مکتوب نگاری کا آغاز ہوا۔ ان سے قبل اُردو میں خطوط نگاری کا وجود ہی نہیں تھا۔ مرزا غالبؔ کی اُردو میں مکتوب نگاری سے قبل فارسی زبان میں خطوط لکھے جایا کرتے۔ جس میں بہت طویل القاب و آداب ہوا کرتے۔ مرزا غالبؔ نے اُردو خطوط نگاری کو فارسی کی اس بوجھل رسم سے چھٹکارا دلوایا۔ گویا ان کے خطوط نے جدید اُردو نثر کی بنیاد ڈالی۔

مرزا غالبؔ نے یہ خطوط یا نثر کی جدید صنف کا آغاز ۱۸۵۰ء سے کیا۔ دورانِ عذر ان خطوط کا سلسلہ زور شور سے جاری رہا۔ ان خطوط سے متعلق تفصیل خطوط نگاری کے تحت پیش کی جائے گی۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ ان ہی خطوط سے سرسید احمد خاں کو سادہ نثر نگاری کی تحریک ہوئی اور ان کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" سادہ نثر نگاری اور سلیس عبارت کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔

مرزا غالبؔ کے خطوط دو طرح سے اہمیت کے حامل ہیں۔ خطوط نگاری کی جتنی بھی خصوصیات بتائی گئی ہیں، وہ سب ان کی ادبی اہمیت کی ضامن ہیں چوں کہ یہ خطوط دہلی میں دورانِ عذر لکھے گئے ہیں جن میں عذر کے دوران دہلی کے سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس طرح یہ خطوط سیاسی یا تاریخی اہمیت کے بھی حامل ہیں۔

غلام امام شہید ۱۸۰۴ء-۱۸۷۶ء

غلام امام شہید لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری میں شہید تخلص کرتے تھے۔ شعراء کی فہرست میں ان کا درجہ بلند تھا۔ لیکن مرزا غالب کی طرح اپنا کلام محفوظ نہ کرتے تھے۔ لہٰذا ان کا کچھ ہی کلام شائع ہوا۔ مصحفی کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں بھی ان کا مقام بلند تھا۔ رامپور گئے تو وہاں نواب کلب علی خاں کے دل میں جگہ بنالی۔ حیدرآباد آئے تو یہاں کے دربار سے انھیں وظیفہ چارسوتیں روپے ملنے لگا جو ایک عرصہ دراز تک ملتا رہا۔ ان کی تصانیف میں مجموعہ مولود شریف "انشائے بہار بے خزاں" شہرت رکھتے ہیں۔ شہید کا انداز تحریر قدامت پسند ہے۔ اس کے باوجود سلاست اور سادگی کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

غلام غوث خاں بیخبر ۱۸۳۴ء تا ۱۹۰۵ء

غلام غوث بیخبر کے آباواجداد کا وطن کشمیر تھا۔ لیکن ان کے والد نے کشمیر سے تبت اور پھر نیپال کا رُخ کیا اور یہیں پر بے خبر پیدا ہوئے۔ کمسنی میں اپنے والد کے ہمراہ بنارس آئے۔ تعلیم و تربیت یہیں ہوئی۔ کم عمری میں ہی شہرت حاصل کرلی۔ اس دور کے رواج کے مطابق اُردو نثر لکھی۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت کو ترک کیا۔ ان کی تصانیف اس طرح ہیں : فغان بیخبر، خونابۂ جگر، "رشک لعل و گہر" اور "انشائے بیخبر" جو ان کے خطوط پر مشتمل ہے۔

اس طرح فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر کالج سے باہر بھی مندرجہ بالا ادیب ملتے ہیں جن میں سے کچھ نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے قدیم انداز تحریر کو اپنایا اور کچھ نے قدیم و جدید ہر دو اندازِ فکر سے اپنی تصانیف پیش کیں لیکن مرزا غالب کے خطوط نے آئندہ ادیبوں کو جدید نثر نگاری کا رجحان دیا۔ اس طرح نہ صرف کلکتہ بلکہ سارے ہندوستان میں اُردو نثر پروان چڑھنے لگی۔

چوتھا باب

دہلی کالج

اُردو ادب کی تاریخ میں دہلی کالج بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔اُردو زبان وادب کے اشاعتی اداروں میں دہلی کالج کو اہم مقام اس لئے حاصل ہے کہ اس کالج کا قیام دہلی کالج کے نام سے عمل میں نہیں آیا بلکہ اس کا آغاز ۱۷۹۲ء میں غازی الدین حیدر کے مدرسے کی حیثیت سے ہوا۔ بعد ازاں ۱۸۲۵ء میں یہ دہلی کالج کے نام سے اپنی شناخت بنا چکا لیکن ابتدائی تین دہائیوں کے حالات پردۂ گمنامی میں ہیں۔ ۱۷۹۲ء میں اس اسکول کی ابتداء دہلی کی خوبصورت اور تاریخی عمارت میں ہوئی۔ یہ غازی الدین حیدر فیروز جنگ ثانی خلف نواب نظام الملک آصف جاہ اول کا بنایا ہوا مدرسہ تھا جو ابتداء میں اینگلو عربک اسکول تھا بعد میں کالج میں تبدیل ہو گیا۔فورٹ سینٹ جارج کالج اور فورٹ ولیم کالج کے برخلاف اس مدرسہ کو کسی انگریز نے قائم نہیں کیا تھا۔اس اسکول کا قیام مشرقی علوم کی تدریس کی غرض سے عمل میں آیا تھا۔

ایک عرصے دراز تک ہندوستان کی سرکاری، درباری، کاروباری اور دفتری زبان فارسی تھی لیکن ۱۸۳۲ء میں فارسی کے بجائے اُردو زبان کو ہندوستان کی سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں مشرقی اور مغربی علوم کو اُردو میں پڑھایا جانے لگا۔ چنانچہ درسی کتابوں کی تیاری کا منصوبہ بنایا گیا اور مترجمین کا انتخاب عمل میں آیا۔اس سلسلے میں ۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۴ء میں ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام قابل ذکر ہے جس نے سائنس، منطق، نجوم، تاریخ انگلستان، تاریخ عالم، اُصول، علم ہیت، ریاضی، رسالہ طب، شرح جراحی کی کتابوں کے ترجمے کو نہ صرف اپنے منصوبے میں شامل کیا بلکہ مندرجہ بالا کتابیں اس کالج کے تحت منظر عام پر آئیں۔ لیکن فورٹ ولیم کالج میں اس طرح کی کتابیں شائع نہیں ہوئیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۰۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی شہر دہلی پر غالب آ چکی

تھی اور اس نے دوسرے علاقوں کی طرح اس شہر میں بھی اپنا جال بچھانا شروع کر دیا اور ضروریات زندگی کے تحت بہ خوشی نہ سہی مجبوراً ہی ۱۸۲۸ء سے مغربی علوم بھی پڑھائے جانے لگے۔ ہر مضمون کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ۔۱۸۴۹ء میں ڈاکٹر اسپرنگر اس کے صدر مقرر ہوئے اور تمام مضامین کی معیاری کتابیں ان کی نگرانی میں شائع ہوئیں ۔اس طرح دہلی کالج بھی انگریزوں کے دست برد سے نہ بچ سکا۔فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کا جو مقام تھا اس سے اُونچا مقام ڈاکٹر اسپرنگر نے دہلی کالج میں بنایا۔دہلی کالج کی مندرجہ ذیل خصوصیات اہمیت رکھتی ہیں :

۱- دہلی کالج میں اُردو زبان کو بحثیت ذریعہ تعلیم اپنایا گیا۔

۲- اس کالج میں ایک ٹرانسلیشن سوسائٹی موجود تھی ۔جس کی مدد سے وقتاً فوقتاً دوسری زبان کی کتابیں ترجمہ کی جاتیں تھیں۔

۳- مشرقی و مغربی علوم اس کالج میں ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور ذکا اللہ وغیرہ اسی کالج کے طالب علم تھے۔اُردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد نے کہا کہ اگر وہ دلی کالج میں نہ پڑھتے تو اندھے، بہرے اور گونگے رہتے۔

ڈاکٹر اسپرنگر کی صدارت میں کالج میں ایک ''لٹریری سوسائٹی'' کا بھی قیام ۱۸۴۲ء میں عمل میں آیا۔تاکہ اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کے کام کی رفتار کو تیز کر سکے۔اس سوسائٹی کے مرکزی کردار ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی تھے جن کی نگرانی میں کالج میں بڑے زور و شور سے تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا۔۱۸۵۷ء تک اس سوسائٹی کا وجود ملتا ہے۔مولوی عبدالحق اپنی تصنیف ''مرحوم دہلی کالج'' میں لفظ مرحوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ''مرحوم میں اس لئے کہتا ہوں کہ وہ ایک عزیز چیز تھی جسے زمانے کے اتفاقات اور حالات نے عین ایسے وقت میں زندہ دفن کر دیا جب کہ اس کے عروج کا وقت آیا تھا اور جب کہ وہ گزشتہ تجربوں سے سبق حاصل کر کے ملک کے لئے تبلیغ علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز بن سکتا تھا۔اس کے ثبوت میں صرف ان

ناموں کا گنادینا کافی ہے جنھوں نے محض اس کالج کے فیض سے ملک میں علم کی روشنی پھیلائی اور علم کی ایسی خدمت کی جو مدتوں یادرہے گی"۔[1]

کالج کے اساتذہ

اس کالج میں جن اساتذہ نے اپنی خدمات پیش کیں ان کا شمار اُردو ادب کے بلند پایہ علماء اور فضلا میں ہوتا ہے۔ جو ساتھ ساتھ فارسی کے بھی عالم تھے ان میں مولانا امام بخش صہبائی کا چرچہ زیادہ ہے۔

مولانا امام بخش صہبائی

اُردو اور فارسی کے زبردست عالم تھے۔ انھوں نے فارسی کی مشہور و معروف تصنیف جو فن بلاغت اور عروض پر مشتمل ہے اور جو درسی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اس قدر بہترین ہے کہ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود آج بھی یہ مقبول ہے۔ یہ تصنیف شمس الدین کی تھی جو "حدائق البلاغت" کے نام سے ملتی ہے۔ اس کتاب کے آخر میں مترجم نے اُردو کے محاورات اور ضرب الامثال بھی لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا صہبائی کی ایک اور کتاب ملتی ہے، جس میں انھوں نے اُردو شعراء کا انتخاب پیش کیا ہے۔

مولانا کے دہلی کالج میں تقرر سے متعلق مولوی عبدالحق اپنی تصنیف "مرحوم دہلی کالج" میں اک واقعہ یوں رقم کرتے ہیں کہ ۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معائنے کے لئے آئے تو انھوں نے فارسی کے لئے ایک بہترین استاد کا تقرر کرنا چاہا۔ مفتی صدر الدین نے انھیں تین شخصیتوں کے نام بتائے۔ جن میں پہلی شخصیت تو مرزا غالب کی تھی لیکن مرزا اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دوسرے مومن خان تھے جو کم از کم ۱۰۰ روپے ماہوار مشاہرے پر ہی کام کرنا چاہتے تھے۔ تیسرے مولانا امام بخش صہبائی تھے، جن کا ذریعہ آمدنی اور کچھ نہ تھا لہٰذا انھوں نے ۴۰ روپے مشاہرہ قبول کرلیا۔

---

[1] مرحوم دہلی کالج مولوی عبدالحق صفحہ ۱۱

ماسٹر رام چندر

ماسٹر رام چندر کا شمار اس کالج کے طلباء اور اساتذہ دونوں میں ہوتا ہے۔ سائنس کے مدرس کی حیثیت سے انھوں نے اپنی خدمات انجام دیں۔ مدرسے کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا لہٰذا سائنس کی تعلیم بھی اُردو زبان میں دیتے۔ ریاضی کے بھی بہترین استاد تھے۔ طلباء پر بڑی محنت کرتے، طلباء بھی ان سے خوش ہوتے۔ ریاضی سے متعلق بھی انھوں نے کتابیں لکھیں۔ انھیں دہلی کالج کا مقبول استاد کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ ماسٹر رام چندر کا نام کالج سے اس طرح جڑ گیا ہے کہ ان کے بغیر کالج کا تذکرہ نامکمل رہ جائے گا۔

مولوی سبحان بخش

ان کا شمار بھی دہلی کالج کے معروف اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ''محاوراتِ ہند'' کے نام سے ان کی کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔ کالج کے پرنسپل نے کالج کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے ان کی تعریف کی ہے۔ ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں تاریخ ابن خلکان کا ترجمہ وفیات اعیان کے نام سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تزک تیموری کا بھی انھوں نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے جو مغلوں کی تاریخ ہے۔ تذکروں میں آپ کے دو تذکرے ''تذکرۂ مفسرین'' اور ''تذکرۂ حکما'' ملتے ہیں۔

شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین

ان کا شمار اس کالج کے طلباء اور اساتذہ دونوں میں ہوتا ہے۔ بحیثیت طالبِ علم ان کا وہ مقام تھا کہ کالج بھی ایسے طلباء پر ناز کرتا ہے۔ بحیثیت مدرس یہ ایک بڑے عالم تھے۔ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر اور بعد میں پروفیسر ہو گئے۔ ذی مرتبہ حیثیت کے حامل تھے۔ اگرچیکہ انھوں نے کئی کتابیں لکھی ہوں گی لیکن افسوس کہ ''رسومِ ہند'' حصہ اول کے سوا ان کی کوئی اور کتاب نہیں ملتی۔

بھیرون پرشاد

بھیرون پرشاد کا شمار بھی دہلی کالج کے طلباء اور اساتذہ دونوں میں ہوتا ہے۔ طلباء کی حیثیت سے بھی انھوں نے کالج کا نام روشن کیا اور خود بھی بہترین طالبِ علم کی حیثیت سے شہرت پائی۔ تمام یونیورسٹی میں اول رہے۔ دورانِ تعلیم کئی وظائف بھی حاصل کئے اور گولڈ میڈل کے بھی مستحق قرار

پائے۔ بعدازاں اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ کالج کے طلباء میں ہی کئی طلباء ایسے تھے جنھیں آگے چل کر استاد کا درجہ ملا۔

مولوی ذکاءاللہ

یہ بھی ذوحیثیت (یعنی طالبِ علم اور استاد) کے حامل مصنف تھے۔ فارسی کے اسکالرس میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اخلاق، طبیعات، تاریخ، جغرافیہ پر مولوی صاحب کی کئی کتابیں ملتی ہیں۔ ریاضی کی تمام شاخوں پر مولوی صاحب کی معیاری کتب ملتی ہیں۔ اتنی کثیر تعداد میں مولوی ذکاءاللہ نے کتابیں لکھیں کہ ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن گیا۔ اس سے ان کی علمی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے فوراً بعد بیس روپے ماہانہ مشاہرے پر کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی خدمات انجام دیں۔

ماسٹر پیارے لال

ماسٹر پیارے لال کا نام بھی مولوی ذکاءاللہ کی طرح طالبِ علم اور استاد دونوں حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ چوں کہ دہلی کے رہنے والے تھے لہٰذا دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ انھیں مولانا امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد یہیں مدرس ہو گئے۔ بعدازاں محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے۔ کئی مدارس کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔ گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب میں بھی انھوں نے ملازمت کی اور اس کے بعد مدارس کے انسپکٹر ہو گئے۔

ان کے علاوہ مولوی احمد علی، میر اشرف علی، ماسٹر حسینی، ماسٹر نور محمد، مولوی حسن علی خاں کے علاوہ پنڈت رام کشن دہلوی کو بھی اس کالج کے استاد رہنے کا شرف حاصل ہے، جن کی کئی تصانیف منظر عام پر آئیں۔

کالج کے قدیم طالبِ علم

دہلی کالج کے اساتذہ کے تذکرے میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ بیشتر اساتذہ وہی ہیں جو اساتذہ کے درجہ پر فائز ہونے سے قبل اسی کالج کے طالبِ علم تھے۔ مطلب یہ کہ بعض طالبِ علم یقیناً بے شمار صلاحیتوں کے حامل تھے کہ طالبِ علمی کے زمانے میں ہی ان کا کافی چرچہ تھا۔ جو زمانہ

تعلیم میں ہی بڑی تیز رفتاری سے ترقی کے منازل طئے کر رہے تھے۔ان میں ماسٹر رام چندر، شمس العلماء مولوی محمد ذکا اللہ، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین، ماسٹر پیارے لال، بھیرون پرشاد، حکم چند وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ان کے علاوہ کئی اور نام ملتے ہیں جو اساتذہ کے درجے پر تو فائز نہیں ہوئے لیکن بحیثیت طالب علم ہی اپنا اچھا ریکارڈ قائم کیا۔اس طرح کالج ایک طویل عرصے تک اپنے مقاصد کی تکمیل میں کامیاب و کامراں رہا۔

کالج کے طلبائے قدیم میں کچھ نام ایسے ملتے ہیں کہ ادبی تاریخ کے صفحات پر ان کے نام ہمیشہ ہمیشہ جلی حروف میں لکھے جاتے رہیں گے۔ان میں شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد اور شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کی تصانیف اُردو ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کی بلند پایہ اور ذی مرتبہ شخصیت کا اندازہ اس طرح بھی لگایا جاسکتا ہے کہ مورخین تاریخ ادب اُردو نے ان کا شمار اُردو نثر کے زرین عہد میں کیا ہے۔لہٰذا ان کا تفصیلی تذکرہ اسی عہد میں کیا جانا ضروری ہے۔

دہلی کالج کے پرنسپلس

۱۸۲۵ء میں جب مدرسہ کالج کی صورت اختیار کر چکا تو ایچ ٹیلر اِس کے منتظم مقرر ہوئے لیکن ٹیلر کو کالج کی ذمہ داری کے علاوہ اور کئی ذمہ داریاں تھیں وہ دوسری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ کالج کی ذمہ داری بھی نبھاتے تھے لیکن ۱۸۳۷ء میں مسٹر ٹیلر کو کالج کے پرنسپل مقرر کئے جانے کی تجویز پیش ہوئی لیکن بعض ناگزیر حالات کی بناء پر یہ تجویز محض تجویز ہی بن کر رہ گئی۔۱۸۴۱ء میں مسٹر ایف بتروس کو کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ یہ علم و ادب سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے قیام میں بتروس نے اہم کردار ادا کیا۔کالج کے قیام کے مقاصد کی تکمیل کے لئے مسٹر بتروس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بڑے جوشیلے، جذباتی اور حرکیاتی انداز میں اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ چاہتے تھے کہ جلد از جلد مفید مضامین کی کتابوں کا ترجمہ دیسی زبان میں ہو جائے۔ کالج کے دو شعبہ جات تھے ایک مشرقی تعلیم کے لئے اور دوسرا مغربی تعلیم کے لئے۔ان کے عہد میں دونوں شعبوں کو قابل لحاظ انداز سے ترقی ہوئی۔ لیکن ۱۸۴۵ء تک انھوں نے خدمات انجام دیں بہ سب

علالت وہ انگلستان واپس ہوئے۔

ڈاکٹر اے اسپرنگر

ڈاکٹر اے اسپرنگر اس کالج کے دوسرے پرنسپل تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے دہلی کالج کو مسٹر بتروس کی کمی محسوس نہ ہونے دی اور ورنیکلر سوسائٹی کی روح رواں بن کر سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔ دہلی کے عوام میں ڈاکٹر اسپرنگر کی شخصیت اس لئے بھی بہت جلد مقبول ہوگئی کہ وہ عربی علم وادب کے جاننے والے تھے۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا مشرقی تعلیمی نصاب کی اصلاح کرتے ہوئے اسے مغربی تعلیم کے دوش بہ دوش لا کھڑا کیا۔ ورنیکلر سوسائٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے ایسے کام انجام دیئے کہ ۱۸۴۸ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں شاہانِ اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کے کام پر مامور کیا۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے بڑی محنت اور دلچسپی سے یہ فہرست تیار کی۔ اس عرصے میں مسٹر ٹیلر نے کالج کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۸۵۰ء میں ڈاکٹر اسپرنگر واپس آئے لیکن بوجہ علالت یہ کچھ ہی ماہ میں شملہ چلے گئے۔

مسٹر کارگل اس کالج کے تیسرے پرنسپل ہیں جنھوں نے ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۴ء کالج میں پرنسپل کی خدمت انجام دی۔ لیکن ان سے متعلق اتنی تفصیلات نہیں ملتی۔

مسٹر ٹیلر

۱۸۵۴ء میں مسٹر ٹیلر جس کا سب سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کارگزار پرنسپل کی حیثیت سے کالج کی ذمہ داری سنبھالی۔ ایک طویل عرصے سے یہ کالج کے پرنسپال نہ ہوتے ہوئے بھی اس کالج سے وابستہ تھے۔ چنانچہ کالج کے در و دیوار سے انھیں اُنس تھا۔ پچھلے تیس سالوں سے وہ ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے اور تین سال تک کالج کے پرنسپل رہے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے ہنگامے میں بھی یہی پرنسپل تھے اور اسی ہنگامے میں وہ اپنی جان شیریں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کی موت دہلی کالج کے اساتذہ، طلباء اور دہلی والوں کے لئے صدمہ جانکاہ ثابت ہوئی۔

غدر کے ہنگامے کے سبب ۱۸۵۷ء میں کالج بند ہو چکا۔ سارے ہندوستان میں برپا ہوئے

انقلاب نے کالج میں بھی انقلاب برپا کردیا۔ نتیجتاً کالج کا کتب خانہ وغیرہ تباہی کی نذر ہوئے۔ گویا کالج کے ایک شاندار دور کا اختتام ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں کالج دوبارہ کھولا گیا۔ جس کا سلسلہ ۱۸۷۷ء یعنی تیرہ سال تک چلتا رہا۔ مختصر عرصے کے لئے کئی پرنسپلس آتے رہے۔ طلباء کی تعداد میں بھی قابل لحاظ کمی آگئی۔ اُردو زبان کے چرچے اگرچہ سارے ہندوستان میں ہو چکے تھے لیکن دہلی کالج میں اُردو تصنیف وتالیف کا سلسلہ محدود ہوتا گیا۔ انگریزی زبان اور مغربی علوم پر توجہ دی جانے لگی۔ بہرحال کالج اپنی خدمات انجام دیتا رہا لیکن کالج کے قدیم طلباء کا بیان ہے کہ کالج اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں تھا۔ اس کے باوجود گورنمنٹ نے اسے ۱۸۷۷ء میں برخاست کر کے اساتذہ اور سارے عملے کو لاہور کالج میں ضم کردیا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے مولوی عبدالحق اپنی تصنیف ''مرحوم دہلی کالج'' میں اپنے اسی خیال کو ظاہر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر لائیز جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے پنجاب گورنمنٹ میں بھی ان کا اثر تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ دہلی کالج بھی لاہور کے گورنمنٹ کالج میں ضم ہو جائے تاکہ لاہور کالج کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور اس کے فروغ پانے میں کوئی دشواری نہ رہے۔

پانچواں باب

جدید اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء

دہلی کالج کے بعد جدید اُردو نثر کا ارتقاء عمل میں آیا۔ اس عہد کو مورخین اُردو ادب نے مختلف نام دیئے۔ کسی نے اسے "نثر کی ترقی" کا عنوان دیا تو کسی نے اس کی نشاندہی "اُردو نثر کا عہد زریں" سے کی۔ پروفیسر احتشام حسین نے اپنی تصنیف "اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ" میں اس عہد کو "نیا شعور اور نیا نثری ادب" کہہ کر متعارف کروایا۔

ان مختلف آراء سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسی پورے عہد میں اُردو نثر کا ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔ ادیبوں نے قدامت پرستی کے بجائے جدت پسندی کو ترجیح دی۔ اس عہد میں یوں تو کئی مصنفین ملتے ہیں جن کے قلم نے نثری جواہر پاروں کی تخلیق کی، ان میں سرسید احمد خاں، محسن الملک، چراغ علی، محمد حسین آزادؔ، الطاف حسین حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، ذکاء اللہ، وقار الملک مولانا شبلی نعمانی اور وحید الدین سلیم جیسی مایہ ناز ہستیوں کے نام ملتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کا نام جدید اُردو نثر کے تذکرے سے اس طرح مربوط ہے کہ ان کی شخصیت ان تمام پر غالب نہ سہی ان سے آگے ضرور دکھائی دیتی ہے۔ یہاں سرسید احمد خاں کی خدمات کو پیش کرنے سے قبل مناسب ہے کہ اس دور کے سیاسی حالات کا اجمالاً جائزہ لیا جائے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال نہ صرف ایک تہذیب کا زوال ثابت ہوا بلکہ اس زوال نے مغربی قوم کو مزید عروج عطا کیا۔ اس طرح حاکم قوم کی تہذیب اور ان کی زبان و ادب سے محکوم قوم مرعوب و مرغوب ہونے لگی۔ ہندوستانی ادیبوں نے جب مغربی ادب سے متاثر ہو کر اُردو ادب کا جائزہ لیا تو انھیں اپنے ادب میں زیادہ تر خامیاں اور کوتاہیاں نظر آئیں۔ یوں رفتہ رفتہ یہ کوششیں کی جانے لگی کہ مغربی شعر و ادب سے ہندوستانی شعر و ادب کو فیض یاب ہونے کے مواقع فراہم کئے

جائیں ۔اس کوشش میں متذکرہ بالا اصحاب نے نمایاں حیثیت حاصل کرلی ۔اسی گروہ کی مشترکہ کوششیں علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

علی گڑھ یا سرسید تحریک کے زیراثر ہی اُردو ادب میں سیاسی ،سماجی ،معاشی ،معاشرتی ، اخلاقی اور مذہبی موضوعات کا اضافہ ہوا۔

اُردو میں جدید نثر یا جدید ادب کی اصطلاح اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ جدید ادب سے قبل قدیم ادب کی روایت رہی ۔جدید نثر یعنی ۱۸۵۷ء سے قبل قدیم نثر یا روایتی ادب کا تصور ملتا ہے جس کی بنیاد ''ادب برائے ادب'' پر تھی لیکن علی گڑھ تحریک کے زیراثر جب ۱۸۵۷ء کے بعد جدید نثر کا آغاز ہوا تو ''ادب برائے زندگی'' کو بنیادی حیثیت حاصل ہوئی۔

غدر ۱۸۵۷ء میں جہاں ہندوستانیوں کے ذہن ودل میں ایک انقلاب برپا ہوا، وہیں ادب کو بھی ایک انقلاب سے دوچار کیا۔کسی بھی زبان کا ادب فن کار کی تخلیق کے سوا کچھ اور نہیں ۔غدر کے خلفشار کے سبب عام لوگوں کا جدید ادب کو قبول کرنا اس لئے مشکل تھا کہ غدر کے نتائج سے عوام میں حکومت انگریزی سے نفرت کا جذبہ مزید شدت اختیار کرچکا تھا ۔کیوں کہ ان کی معاشی ابتری ، بے روزگاری اور بھوک کے ضامن انگریز ہی تھی ۔ان حالات میں مغربی ادب اور اس کے طور طریقے شعارِ زندگی کو قبول کرنا ایک مشکل امر تھا ۔ان نامساعد حالات میں سرسید کی تحریک اور ان کے رفقاء نے ادب میں نئے رجحانات پیدا کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

سرسید احمد خاں ۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء

تاریخی لحاظ سے سرسید کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ۔اس لئے کہ وہ کئی حیثیتوں سے اپنی شناخت رکھتے ہیں ۔وہ علی گڑھ تحریک، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جدید ادب کے بانی دانشور، ادیب اور مصلحِ قوم کہلاتے ہیں۔

بحیثیت مصلحِ قوم سرسید نے غدر کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی ۔اس سلسلے میں انھوں نے محسوس کیا کہ زوال کا اہم سبب علوم وفنون سے دوری ہے ۔جس علم وفن کے سبب انگریز ساری دُنیا پر چھا گئے، انھیں علوم سے عدم واقفیت نے ہندوستانیوں کو ناکامی

سے ہمکنار کیا۔

سرسید نے جدید علوم وفنون پر مشتمل تعلیمی تحریک کا آغاز کیا جو آگے چل کر علی گڑھ تحریک کے نام سے مقبول ہوئی ۔ ابتداء میں قدامت پسند لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور سرسید پر تنقید کی بوچھار کردی لیکن سرسید نے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہوئے بڑی ثابت قدمی سے اپنے مشن کو کامیاب بنایا۔ انھوں نے ہندوستانیوں میں وسیع النظری اور روشن خیالی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ سرسید نے بیک وقت کئی محاذوں پر کام کیا۔ مذہب، ادب، معاشرت، تعلیم، سیاست اور ہندوستانیوں کے مسائل وغیرہ سرسید کی اس تگ ودو کے بارے میں عظیم الحق جنیدی لکھتے ہیں :

''اگر سرسید صرف قرآن وحدیث کی طرف توجہ کرتے تو بلند پایہ علمائے دین میں ان کا شمار ہوتا، رشد وہدایت دینے خانقاہ میں بیٹھ جاتے تو ایک عالم ان سے فیض پاتا، اگر سیاسی رہنمائی پر اکتفاء کرتے تو اس میدان میں قوم کے کارواں سالار ہوتے ، اگر صرف مسائل تعلیم پر غور کرتے تو دُنیا کے مشہور ماہرین تعلیم کی صف میں جگہ پاتے ۔ اگر شاعری کرتے تو غالبؔ واقبالؔ کے ہم پلہ ہوتے مگر وہ تخصیص کا راستہ اختیار نہ کر سکتے تھے۔ کیوں کہ وہ پیدا ہوئے تھے ہندوستانی مسلمانوں کو پستی وزبوں حالی سے نکالنے کے لئے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ایسے ماہر طبیب کی ضرورت تھی جس کے پاس ہر مرض کا علاج ہو اور ہر درد کا مداوا ہو''۔[1]

جس طرح سرسید نے کسی ایک مقصد کے لئے اپنے دائرے کو محدود نہ کیا بلکہ ہر محاذ پر کام کرتے رہے، بالکل اسی طرح اُردو زبان وادب کو بھی روایت کے دائرے سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی ۔ انھوں نے اُردو نثر کو مقفی ومسجع بندشوں سے آزاد کیا اور اُردو زبان میں ہر قسم کے خیالات کا اظہار کر کے اس میں اتنی وسعت پیدا کی کہ وہ مختلف علوم کے بیان پر قادر ہوگئی۔

سرسید کی تصانیف میں ''خطبات احمدیہ''، ''آثار الصنادید''، ''تاریخ سرکشی بجنور'' وغیرہ کے

---

[1] اُردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی صفحہ ۲۱۵

علاوہ "رسالہ تہذیب الاخلاق" ان کا مقبول عام رسالہ ہے جس میں مذہبی بحث مباحثے کے سلسلے میں ان کا جواب دینے والوں نے بھی وہی سیدھا سادہ انداز اپنایا جو سرسید کا تھا جب کہ اس رسالے کا مقصد یہی تھا کہ مذہبی مسائل بھی حل ہو جائیں اور لوگوں میں مقفیٰ و مسجع عبارت کو چھوڑ کر سادہ سلیس اور رواں عبارت لکھنے کا رجحان بھی عام ہو جائے۔

سرسید کے رفقاء

سرسید کے رفقاء نے سرسید تحریک کو آگے بڑھانے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ ان میں محمد حسین آزاد، مولانا حالؔی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سبھوں کو لوگ اُردو کے عناصر خمسہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ سرسید کے ساتھ اگر ان کا ذکر نہ کیا جائے تو تحریک کا لفظ بے معنی ہو جائے گا۔

محمد حسین آزاد ۱۸۳۰ء تا ۱۹۱۰ء

محمد حسین آزاد کا شمار دہلی کالج کے قدیم طلباء میں ہوتا ہے۔ آزاد کی شخصیت بھی کئی زاویوں سے اپنی شناخت رکھتی ہے۔ عربی اور فارسی زبان پر عبور رکھنے کے سبب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایک طویل عرصہ عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائیڈ کی صدارت میں انجمن پنجاب کے تحت آزؔاد اور حالؔی نے مل کر موضوعاتی نظموں پر مشتمل مناظموں کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح نظم کی ترویج میں آزاد کا شمار ہوتا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے آزاد نے اپنی جو یادگار چھوڑی ہے وہ بہت ہی قلیل ہے لیکن نثر نگار کی حیثیت سے ان کا جواب نہیں۔ اگرچیکہ آزاد نے مقفیٰ و مسجع نثر نہیں لکھی۔ اس کے باوجود بیان کی دلکشی قابل دید ہے۔

"آبِ حیات" کو آزاد کی معرکۃ آلارا تصنیف ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اِسے تذکرہ نگاری کی آخری اور تاریخ اُردو ادب کی پہلی کڑی مانا جاتا ہے۔ اُردو زبان کی شاہکار تصانیف میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ آزاد کے دلکش اُسلوب کے سبب "آبِ حیات" نے لازوال شہرت حاصل کی۔

آزاد کی دوسری تصانیف میں "دربار اکبری" اور "نیرنگ خیال" اہمیت رکھتی ہیں۔ دربار اکبری میں اکبر اعظم کے دربار کی مکمل تفصیل ملتی ہے اور "نیرنگ خیال" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

آزادؔ نے اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوقؔ کا دیوان بھی مرتب کیا لیکن ان کی تمام تصانیف پر ان کی مایہ ناز تصنیف ''آبِ حیات'' غالب آجاتی ہے جو اُردو ادب میں گرانقدر سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی ایک فارسی تصنیف ''سخن دانِ فارس'' کے نام سے ملتی ہے جو زبان دانی کے اُصولوں پر مشتمل ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء

الطاف حسین حالیؔ کا نام اُردو ادب وشاعری کے لئے محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ بہ یک وقت شاعر، ادیب، نقاد، مصلح قوم، پہلے سوانح نگار اور نظم کے بانی کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ اس ہشت پہلو شخصیت کے حامل باکمال شخص کا ہر پہلو آب و تاب رکھتا ہے۔

حالی انگریزی ادب سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اسی طرز پر سوانح نگاری کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں ''حیاتِ سعدی''، ''یادگارِ غالب'' اور ''حیاتِ جاوید'' منظر عام پر آئی۔ حالیؔ نے مختلف سماجی اور سیاسی مسائل پر بڑے سلجھے ہوئے مضامین لکھے جو ''مقالاتِ حالیؔ'' کے نام سے شائع ہوئے۔

نقاد کی حیثیت سے حالی کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو ''مقدمہ شعر و شاعری'' جیسی مایہ ناز تخلیق ہمارے سامنے ہے۔ بیس سال تک شیفتہؔ، مرزا غالبؔ اور مومنؔ کے زیر اثر مسلسل قدیم طرز کی غزل گوئی کے بعد ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں غزل پر سخت تنقید سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سرسید کے نظریات سے کس قدر متاثر ہیں۔ اپنی اسی تصنیف میں انھوں نے مختلف زبانوں کی تصانیف کے مطالعے سے استفادہ کرتے ہوئے فن شعر پر بحث کی ہے اور سادگی، اصلیت و جوش کو اُردو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ مسدس حالیؔ یا مدو جزر اسلام، حالیؔ کی وہ نظم ہے جس سے ان کی شناخت نقاد اور مصلح قوم کی حیثیت سے ہوئی۔ انگریزی شاعری کے اثرات اُردو شاعری پر اس طرح پڑے کہ کرنل ہالرائیڈ کی صدارت میں پنجاب میں انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ یوں آزادؔ اور حالیؔ کی کوششوں کے سبب اُردو میں باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز ہوا۔

حالیؔ کی نثر مسجع اور مقفی نہیں بلکہ سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود اس کی دلکشی اور دل آویزی قابل دید ہے۔ مولانا حالیؔ نے سرسید کے دست راست بن کر ان کے مشن کو آگے بڑھانے میں

نمایاں کردار ادا کیا۔ حالی کے دل میں قوم کا درد بدرجہ اتم موجود تھا۔ سرسید کی صحبت نے اسے مزید جلا بخشی اور اسی اثر نے حالی کو سرسید کی سوانح ''حیاتِ جاوید'' لکھنے پر مائل کیا۔

ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء

ڈپٹی نذیر احمد کا شمار بھی دہلی کالج کے قدیم طلباء میں ہوتا ہے۔ مولوی نذیر احمد کو اُردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ ضلع بجنور سے تعلق رکھتے تھے لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے دہلی آئے۔ اپنی خداداد ذہانت کے سبب دہلی کالج میں نہ صرف داخلہ ملا بلکہ انتظامیہ کی جانب سے وظیفہ ملتا رہا۔ وہ اس کالج سے آٹھ سال وابستہ رہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد پنجاب کے ایک مدرسے میں مدرس کی حیثیت سے دو برس تک خدمات انجام دیتے رہے بعد ازاں کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔

۱۸۵۷ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد مقرر ہوئے۔ اپنی ذاتی دلچسپی اور شوق و محنت سے انگریزی زبان سیکھی۔ انگریزی حکومت کی خواہش پر نذیر احمد نے دوسروں کے ساتھ مل کر قانون جرائم کی کتاب کا ''تعزیراتِ ہند'' کے نام سے ترجمہ کیا، جس کے صلے میں سرولیم میور نے نذیر احمد کو کانپور کا تحصیلدار کر دیا۔ بعد ازاں ترقی کر کے وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے یہی ان کے نام کا سابقہ بن گیا۔

سرسالار جنگ اول نے انھیں ۸۰۰ روپے ماہوار پر حیدر آباد بلایا۔ یہاں نذیر احمد نے کافی ترقی کی۔ ۱۸۸۳ء میں سالار جنگ اول کی وفات کے بعد نذیر احمد دہلی واپس آ گئے۔ سرسید احمد خاں کی کوششوں سے متاثر ہو کر اُردو نثر کی ترقی کے لئے نذیر احمد نے ناول نگاری کو اپنایا۔ انگریزی سے واقفیت کی بناء پر انگریزی ناولوں کے طرز پر اُردو میں متعدد ناول لکھے۔ اپنی ناولوں میں نذیر احمد نے ہندوستانی مسلمانوں کو ہی کردار بنایا۔ عموماً ان کے ناول اصلاحی ہوتے، جس کا مقصد ہندوستانی سماج میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کرنا ہوتا۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ اور ابن الوقت ان کے اہم ناول ہیں۔ مراۃ العروس اور بنات النعش لڑکیوں کی تربیت اور اصلاح کے لئے لکھے گئے۔ انھوں نے اپنی ناولوں میں واعظانہ انداز بیان کو اپنا کر ان سے تبلیغ کا کام بھی لیا اور اخلاقی درس دیا۔

فن ناول نگاری کے تحت ان کی ناولوں کو جانچا جائے تو ممکن ہے کہ یہ فن پر پورے نہ اُتریں لیکن اُردو ناول نگاری کی شروعات ہونے کے سبب اہمیت کے حامل ہیں۔

نذیر احمد نے ناول نگاری کے علاوہ قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ترجمہ کے دوران انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ترجمہ لفظی نہ ہو بلکہ قرآن مجید کی آیتوں کے حقیقی مفہوم کو اُردو زبان کے مزاج کے مطابق پیش کیا جائے۔

نذیر احمد کو فن تحریر کے ساتھ ساتھ فن تقریر پر بھی عبور تھا۔ ان کی تقاریر سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہوئیں۔

گورنمنٹ نے نذیر احمد کی علمی خدمات پر ۱۸۹۸ء میں انھیں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا۔

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء

ضلع اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرسید کے رفقاء میں شبلی کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ ایک بلند پایہ مورخ، محقق، نقاد، شاعر اور سوانح نگار کی حیثیت سے وہ شہرت رکھتے ہیں۔ علماء میں بھی ان کا مرتبہ بلند ہے۔ علی گڑھ میں ان کی ملاقات سرسید سے ہوئی تو وہ ان کی خدمات سے بہت متاثر ہوئے نیز سرسید کے کہنے پر علی گڑھ کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۸۹۸ء میں وہ حیدرآباد آئے محکمہ تعلیمات میں بھی کچھ عرصہ خدمات انجام دیں۔

شبلی نعمانی نے سوانح نگاری میں جدید طرز کو اپنایا اور اسلامی شخصیتوں کے حالات زندگی کو قلم بند کیا۔ الفارق، المامون اور سیرت النبیؐ اس سلسلے کی اہم کتابیں ہیں۔ ان کا شمار اُردو کی شاہکار تصانیف میں ہوتا ہے۔ ان تصانیف کی تحریر کے دوران شبلی نے اسلامک ممالک کا سفر بھی کیا۔ "سفر نامہ مصر روم وشام" اس سلسلے کا اہم سفر نامہ ہے۔ شبلی نے تنقید پر کافی توجہ دی۔ "موازنہ انیس و دبیر" ان کی تقابلی تنقید کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ اُردو ادب میں شبلی نے اسی تصنیف کے سبب اپنی شناخت بنائی جس سے اُردو میں پہلی مرتبہ موازنہ کا رجحان پیدا ہوا۔

بحیثیت مورخ ان کی تحریر کردہ "شعر العجم" کی چھ جلدیں ملتی ہیں، جس میں انھوں نے فارسی

شعراء کی مبسوط تاریخ لکھی۔ تاریخ نویسی میں بھی شبلی کا اسلوب نہایت دلچسپ و دلکش ہے۔ جس سے تاریخ جیسا خشک مضمون بھی پر لطف ہو جاتا ہے۔

شبلی نے دہلی اور لکھنؤ سے دور رہتے ہوئے بھی اپنے پر لطف طرزِ نگارش سے اپنی تحریروں کو وہ تازگی عطا کی کہ یہ تصانیف یکساں اہمیت کی حامل ہوئیں۔ تشبیہات اور استعاروں سے بھی شبلی نے اپنی تحریر کو دلچسپ بنایا ہے۔ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے نصابِ تعلیم میں اصلاح کے مقصد کے تحت ندوۃ العلماء قائم کیا تھا۔ علاوہ ازیں ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ دینی علوم کی ترقی بھی ممکن ہو سکے لیکن اس میں انھیں اتنی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ عمدہ اور بلند پایہ مصنفین کی ایک جماعت تیار ہو جائے۔ اس غرض کے لئے انھوں نے صرف اپنا قیمتی وقت ہی نہیں بلکہ اپنی جائیداد بھی وقف کر دی۔

گورنمنٹ نے شبلی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا۔

محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

سید مہدی علی نام اٹاوہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور کلکٹری میں ملازم ہوئے۔ رفتہ رفتہ تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ملازمت کے دوران قانون سے متعلق دو کتابیں لکھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں لکھنے پڑھنے کا کس حد تک شوق تھا۔ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

ریاست حیدرآباد نے انھیں محسن الملک منیر نواز جنگ کے خطاب سے نوازا۔ ۱۸۷۴ء میں ریاست حیدرآباد نے انھیں انسپکٹر جنرل (مالیات) کی بہترین کارگزاری اور خدمات کے سبب معتمد مال مقرر کیا جس کی یافت بارہ سو روپئے کے بجائے تین ہزار روپئے تھی۔ ۱۸۹۳ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ چلے گئے اور اپنی بقیہ زندگی قومی خدمات کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کالج کے انتظامیہ کے لئے وقف کر دی۔

محسن الملک کو تقریر اور تحریر دونوں پر یکساں ملکہ حاصل تھا۔ سر سید کے رفقاء میں انھیں اس

لئے اہمیت حاصل ہے کہ محسن الملک کا انداز تحریر بھی سرسید سے مشابہ ہے۔ سرسید کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین زیادہ تر مذہب اور اخلاق کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کی تحریر بے باک اور متاثر کن ہوتی۔ انداز بیان نہایت سادہ اور سلیس ہوتا۔ سرسید کے رفقاء بھی ان کی تحریر کی خوبی کے قائل تھے۔

قیام حیدرآباد کے عرصے میں انھوں نے فارسی کے بجائے اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنانے میں بڑا اہم اور مثبت کردار ادا کیا۔ ریاست حیدرآباد میں یوں تو کئی اہم شخصیتیں آئیں لیکن جو مقبولیت اور شہرت نواب محسن الملک کو حاصل ہوئی وہ شائد ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔

محسن الملک کا شمار اگرچیکہ اُردو کے اعلیٰ اور بلند پایہ ادیبوں میں نہیں ہوتا، اس کے باوجود ان کے مضامین میں ادبیت کی شان ضرور پائی جاتی ہے۔

عموماً وہ عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی کی کتابوں کا ترجمہ کروا کے مطالعہ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین میں مغربی خیالات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔

یہ وہ دور تھا جب کہ مسلمانوں میں معاشی ابتری کے سبب ان کی جاہ وثروت سب کچھ ختم ہوچکی تھی اور مسلمان اپنے مذہب سے بہت قریب ہو چکے تھے۔ اس دور کے تقریباً ادیبوں اور مصنفین کی تحریریں مذہبی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ محسن الملک کی تحریر میں بھی یہی خصوصیت ملتی ہے۔

اپنی موثر تحریر اور متاثر کن تقاریر کے ذریعہ محسن الملک نے نہ صرف سرسید کے مشن کو آگے بڑھایا بلکہ علی گڑھ کالج کی ترقی کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ سرسید کے سخت ترین مخالفین کو بھی انھوں نے اپنی جادو بیانی سے سرسید کا موافق بنا دیا۔

سرسید کی وفات کے بعد محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری ہو گئے۔ سرسید کی زندگی کے آخری ایام میں اُردو زبان کی مخالفت کا آغاز یعنی اُردو ہندی کا تنازعہ پیدا ہوا۔ سرسید نے باوجود سخت علالت کے اس تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے کمر ہمت باندھی لیکن ان کے بعد اس تنازعہ نے زور پکڑا۔ نواب محسن الملک نے زبان کی حمایت کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اپنی پرجوش تقاریر کے

ذریعے لوگوں کے دلوں میں جوش پیدا کیا جس کا اثر کافی عرصے تک رہا۔

۱۹۰۷ء میں محسن الملک کا انتقال شملہ میں ہوا اور علی گڑھ کالج کے صحن میں سر سید کے پہلو میں دفن ہوئے۔

چراغ علی ۱۸۴۶ء تا ۱۸۹۵ء

مولوی چراغ علی کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے زندگی کے مدارج کو طئے کرنے کے لئے دوسروں کا سہارا تلاش نہیں کیا بلکہ اپنے بل بوتے پر ہی اپنی انفرادی شناخت بنائی۔ یہ دس سال کی عمر میں ہی والد مولوی محمد بخش کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ بزرگوں کا وطن تو کشمیر تھا لیکن والد بسلسلۂ ملازمت پنجاب آئے۔ بعد ازاں میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی۔ چراغ علی نے والد کے انتقال کے بعد والدہ اور دادی کے زیر سایہ ابتدائی اور بنیادی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ فارسی انگریزی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔ فکرِ روزگار نے باقاعدہ حصولِ تعلیم سے باز رکھا۔ مطالعہ کے فطری ذوق نے ہمت بندھائی۔ چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرتے ہوئے مطالعہ کتب کو جاری رکھا۔ مطالعہ کتب کے پیہم سلسلے نے انھیں کئی زبانوں کا ماہر بنادیا اور جلد ہی انگریزی، یونانی اور لاطینی زبان پر عبور حاصل کرلیا۔ ذوقِ مطالعہ سے آگے بڑھ کر تحریر پر مائل ہوئے اور انگریزی زبان میں بہترین کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں اس زمانے کے اُردو رسائل میں بھی آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ محسن الملک کی طرح یہ بھی تقریر و تحریر دونوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں پر بھی مذہبی رنگ غالب تھا

مولوی چراغ علی ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ، سیتاپور، حیدرآباد اور علی گڑھ گئے۔ جوڈیشیل کمشنری میں منصرم ڈپٹی مقرر ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے تحصیلدار کے عہدے پر پہنچے۔ جب سر سید سے ملاقات ہوئی تو وہ ان کی قابلیت اور صلاحیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ''تہذیب الاخلاق'' میں ان کے مضامین بہ پابندی شائع ہوتے رہے۔ سر سید کے توسط سے حیدرآباد میں مددگار معتمد مال گزاری، بعد ازاں اپنی لیاقت کے سبب معتمد مالگزاری مقرر ہوئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

مولوی چراغ علی کی ترقی کا راز ان کی قابلیت، لیاقت، شبانہ روز محنت اور وقت کی پابندی

ہے۔ ترقیوں کے ساتھ ساتھ تحریر وتقریر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہ اپنا تھوڑا سا وقت بھی ضائع نہ کرتے جس کے باعث زمانے نے بھی ان کی قدر ومنزلت کی۔ سرکاری اُمور پر بھی ان کی تصنیف کی ہوئی کتابیں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئیں۔ مولوی چراغ علی کی تحریر کردہ کتابوں میں ادبی شان بہت کم ہے جب کہ زیادہ تر مذہب کا رنگ غالب ہے۔

وہ زیادہ سے زیادہ وقت علمی مشاغل میں مشغول رہتے۔ ان کے کئی علمی مضامین جو اخبارات ورسائل میں چھپے اس پر تبصرے بھی لکھے جاتے۔ مولوی چراغ علی نے ۱۵/ جون ۱۸۹۵ء کو انتقال کیا۔ یوں تو مرحوم کی وفات پر کئی اصحاب نے اُردو اور انگریزی اخبارات میں اظہارِ غم کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مگر نواب سر وقار الامراء بہادر مدار المہام وقت نے سرکار کی جانب سے جریدۂ اعلامیہ میں اظہارِ افسوس کیا۔ جس سے مرحوم کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے :

"مولوی چراغ علی کی وفات سے ریاست کا ایسا بے لاگ بے لوث مستقل مزاج تجربہ کار عہدیدار جاتا رہا کہ پھر اس کا بدل نہ ملا، اُدھر قوم میں سے ایک حامیٔ ملت اور فاضل محقق گم ہوگیا۔ جن مضامین پر مولوی چراغ علی مرحوم نے قلم اُٹھایا ہے۔ اس پر اور بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور زمانہ آئندہ اس سے بھی معتبر لوگ پیدا کرے گا۔ لیکن ایسے دھن کے پکے دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں ہمہ تن محو مشکل سے پیدا ہوں گے"۔ [1]

سر سید نے بھی اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں مرحوم کے انتقال پر گہرے رنج کا اظہار کیا۔

ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء

ذکاء اللہ دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ دہلی کالج کے طلباء اور اساتذہ دونوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دہلی کالج سے متعلق تصانیف میں مولوی ذکاء اللہ کا ذکر ملتا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں سینئر پرشین (Senior Persion) اسکالرشپ حاصل کی۔ حصولِ تعلیم کے بعد اسی کالج

---

[1] چند ہم عصر صفحہ ۶۶،۶۵

میں استاد مقرر ہوئے۔ ابتداء میں ریاضی پڑھائی بعد ازاں ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس اور سب سے آخر میں میسور کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ایک طویل عرصہ تک آپ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

مولوی ذکا اللہ نے اُردو زبان و ادب کے مختلف علوم پر تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ہیں۔ موصوف نے زیادہ تر کتابیں طلباء برادری کے لئے تحریر کیں۔ تاریخ ہند کی دس جلدیں مولوی ذکا اللہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ذکا اللہ کی انفرادیت یہ ہے کہ جتنے موضوعات پر انھوں نے قلم اُٹھایا ہے کسی اور مصنف یا ادیب نے اپنی تحریروں میں اتنے موضوعات کا احاطہ نہیں کیا۔ ان کی ڈیڑھ سو کتابوں میں سے کچھ کتابیں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں۔ ذکا اللہ کا اندازِ بیان یا طرزِ تحریر دوسروں سے مختلف ہے۔ سلاست اور روانی کے باوجود حالی کے خیال کے مطابق ان کے مضامین میں ادبی شان کم ہی پائی جاتی ہے۔

ذکا اللہ کا شمار انگریزی حکومت کے موافقین میں ہوتا ہے۔ ان کی مجموعی خدمات تصنیف و تالیف کے سلسلے کو سراہتے ہوئے انگریزی حکومت نے انھیں ''خان بہادر'' اور ''شمس العلماء'' جیسے خطابات سے نوازا۔

بحیثیت مضمون نگار ذکا اللہ کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان کے مضامین کے کئی مجموعے جیسے ''محاسن الاخلاق''، ''تہذیب الاخلاق آریا ہند'' اور ''مکارم الاخلاق'' کے نام سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف رسائل میں بھی ان کے چیدہ چیدہ مضامین شائع ہوئے، جن کا ذکر پروفیسر سیدہ جعفر نے اپنی تصنیف ''اُردو مضمون کا ارتقاء'' میں کیا ہے۔ جس کے مطابق ذکا اللہ کے مضامین کی تعداد ۱۰۹۱ ہے۔ ان کے مضامین کے عنوانات دوسرے مضمون نگاروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں موقعہ و محل کی مناسبت کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء کا عہد پہلی جنگِ آزادی اور جاگیرداری نظام کے خاتمے سے عبارت ہے۔ یہ ایسے اہم واقعات تھے جن کا اثر ذکا اللہ نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے اپنے افسانوں میں بھی پیش کیا۔

اپنے مضامین میں انھوں نے ادب برائے زندگی کے نظریئے کو پیش کیا ہے۔ وہ تخیل کی نہیں

بلکہ حقیقی دُنیا اور اس کے مسائل کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے ایسے موضوعات کو اپنے مضامین کے لئے منتخب کیا جس پر کسی دوسرے نے اپنا قلم نہ اُٹھایا ہو۔

پروفیسر سیدہ جعفر کے نظریئے کے مطابق ذکا اللہ نے ماسٹر رام چندر کی مضمون نگاری کا زیادہ اثر قبول کیا۔ سادہ اور سلیس عبارت اور پرخلوص انداز بیان ذکا اللہ کی تحریر کی خصوصیت ہے۔ انگریزوں کے موافق ہونے کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ وہ ہندوستان کے امراء اور روساء کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو بہ خوشی حصولِ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجیں تاکہ وہ مغربی علوم وفنون سیکھیں اور انگریزی زبان پر عبور حاصل کرسکیں۔

وقار الملک ۱۸۴۱ء تا ۱۹۱۷ء

اُردو زبان وادب کے میر کارواں سرسید احمد خاں کے ہمراہیوں میں مشتاق حسین وقار الملک کا نام بھی ملتا ہے۔ سرسید کچھ ایسی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ جو بھی ایک بار ان سے ملتا وہ ان کے کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا اور ان کے نقش قدم پر چلنا اپنا فرض عین سمجھتا۔ وقار الملک بھی اپنی اولین ملاقات میں سرسید سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سرسید کے خیالات کو عام کرنے میں وقار الملک نے بڑا مثبت کردار ادا کیا۔ سرسید نے انھیں سائنٹفک سوسائٹی کا ممبر بنایا۔

وقار الملک کے اجداد کو شاہ جہاں کے دربار میں رسائی حاصل تھی۔ یہ ضلع میرٹ میں پیدا ہوئے۔ چھ مہینے کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نانا نے ان کی پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم امروہہ کے مکتب میں پانے کے بعد مراد آباد کے مدرسے میں باقاعدہ تعلیم پائی۔ بعدازاں انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا لیکن نانا کا خواب جو انھیں انجینئر بنانے کا تھا پورا نہ ہوسکا۔ شادی کے بعد فکرِ معاش نے ملازمت میں جوت دیا۔ مختلف ملازمتیں کرتے ہوئے وہ تقریباً ۱۸۶۰ء میں علی گڑھ چلے آئے، وہاں سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر بننے کے بعد ایک مدرسہ اور شفاخانہ بھی کھولا۔ ۱۸۷۵ء تا ۱۸۷۹ء ان کا قیام حیدرآباد میں رہا۔ نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے ان کے عوامی خدمات کے عوض انھیں ۱۸۸۵ء میں ''خان بہادر'' اور ''انتصار جنگ'' کے خطابات دیئے اور ۱۸۹۰ء میں انھیں وقار الملک کے باوقار خطاب سے نوازا گیا۔ حیدرآباد سے جاکر بھی وہ

علی گڑھ کالج اور سائنٹفک سوسائٹی کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔

وقارالملک نے مضمون نگار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی۔ ذکا اللہ کی طرح انھوں نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے انھیں ادب برائے زندگی کی طرف راغب کیا۔ انھوں نے ہر طرح کے موضوعات جیسے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی وغیرہ پر قلم اُٹھایا ہے۔ وہ اپنے مضامین میں حکومت کی کوتاہیوں کو بھی بغیر کسی جھجک کے بیان کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو مغربی علوم کی تحصیل پر مائل کرتے تھے۔

وقارالملک کا اندازِ تحریر بے انتہا دلچسپ اور مؤثر ہوتا، اپنے خیالات کو بڑے دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔

وحیدالدین سلیم ۱۸۶۷ء تا ۱۹۲۸ء

پانی پت کی مشہور و معروف شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر انھیں ملکہ حاصل تھا۔ عربی و فارسی کے عالم کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُردو کی تصنیف ''وضع اصطلاحاتِ علمیہ'' ان کی قابلیت، صلاحیت اور علمیت کا ثبوت دیتی ہے۔ علمی اصطلاحات کو وضع کرنا کچھ آسان کام نہیں مگر وحیدالدین سلیم نے یہ کارنامہ انجام دیا۔

بہ حیثیت عالم، شاعر، ادیب اور صحافی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ مسلم گزٹ میں حالاتِ حاضرہ پر انھوں نے جو مضامین لکھے اس کا جواب نہیں۔ جب علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ذمہ داری سنبھالی تو اسے لازوال زندگی بخشی۔ مولانا فیض الحسن جیسے مستند استاد کی شاگردی اور سرسید احمد اور حالؔی کی رہبری و رہنمائی نے ان کی شخصیت کو اُبھارنے میں مثبت کردار ادا کیا۔ حالؔی کے توسط سے یہ علی گڑھ پہنچے۔ وہاں سرسید کے پرچوں تہذیب الاخلاق اور گزٹ میں اپنی صلاحیت اور علمیت کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ سرسید نے ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر انھیں اپنا لٹریری اسسٹنٹ مقرر کیا۔ سرسید کی فیض صحبت نے ان پر ایسا اثر ڈالا کہ علمی و تحقیقی میدان کی شہواری کا ذوق پیدا ہوا۔ سرسید کی تحریک کو آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئے۔

دارالترجمہ حیدرآباد سے بھی ان کا تعلق رہا اور عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی ان کی خدمات سے

استفادہ کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس دور میں مولانا جیسا پروفیسر ملنا دشوار تھا۔ اُردو ذریعہ تعلیم کی اس یونیورسٹی میں طلباء میں تعلیمی رجحان کو فروغ دینے اور ان میں ذوقِ علم کو اُبھارنے میں مولانا نے مثبت کردار ادا کیا۔

ان کی تصانیف میں ''افادات سلیم'' بھی ملتی ہے۔ نئے الفاظ بنانے میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ ''وضع اصطلاحاتِ علمیہ'' کے دوران انگریزی الفاظ کے اُردو ترجمے پر انگریز بھی ان کی قابلیت پر دنگ رہ جاتے تھے۔ مولانا نے اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں بسر کی۔ مولوی عبدالحق اپنی معروف تصنیف ''چند ہم عصر'' میں مولانا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں علم و ادب کا ستون قرار دیتے ہیں اور ان کی موت کو قومی حادثے سے تعبیر کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا تمام شخصیتوں کا شمار سرسید کے رفقاء اور ان کے معاصرین میں ہوتا ہے۔ جدید اُردو نثر کے آغاز میں سرسید کا نام سرفہرست ہے لیکن حالؔی، شبلؔی اور محمد حسین آزاؔد کے علاوہ محسن الملک، چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، ذکا اللہ، وقار الملک اور وحید الدین سلیم نے سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ ان سبھوں نے مل کر سرسید کے خیالات اور نظریات کو عام کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

علی گڑھ تحریک کے سبب کئی اصناف نثر کا آغاز ہوا۔ اُردو تنقید بھی نئی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ سرسید نے صحت مند تنقید کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنایا۔ چنانچہ حالؔی نے سرسید کے رفیق کار کی حیثیت سے اُردو میں باقاعدہ تنقید کی بنیاد ڈالی۔

ناول اور سوانح نگاری وہ اصناف ہیں جنھیں سرسید تحریک کے سبب بڑی ترقی ہوئی جب کہ مضمون نگاری ایسی صنف ہے جس کا باقاعدہ آغاز سرسید سے ہوا۔ ان تمام نثری اصناف کے علاوہ شعری اصناف میں نظم ایسی صنف ہے کہ سرسید کے بے حد اصرار پر حالؔی نے مایہ ناز نظم ''مدوجزر اسلام'' موسوم بہ ''مسدس حالؔی'' لکھی۔

☆☆☆

چھٹا باب

اودھ پنچ کی خدمات ۱۸۷۷ء تا ۱۹۱۲ء

اودھ پنچ جس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین ہیں اُردو میں صرف ایک اخبار کی حیثیت سے ہی اپنی شہرت نہیں رکھتا بلکہ جہاں اُردو کے ادیب اس کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں تو وہیں اُردو ادب کے مورخین تاریخ اُردو ادب میں اسے ایک ذیلی باب کی شکل دیتے ہیں۔ اودھ پنچ کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کچھ کتابیں بالکلیہ اودھ پنچ کے موضوع پر ہی ملتی ہیں جیسے ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی کی کتاب ''اودھ پنچ کی ادبی خدمات'' کے عنوان سے موجود ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے تاریخ ادب اُردو میں اودھ پنچ کا تذکرہ ''افکار واسالیب کا تفاوت، اودھ پنچ، تہذیبی اور ادبی تناظر'' کے عنوان کے تحت کیا ہے۔ اسی طرح اُردو نثر میں طنز ومزاح سے متعلق جتنی بھی تصانیف منظر عام پر آئیں، ان میں مصنفین نے اودھ پنچ کا تذکرہ لازمی طور پر کیا ہے۔

ہندوستان میں لیتھو پریس کے قیام کے ساتھ ہی کئی رسائل اور اخبارات نکلنے شروع ہوئے اس دور کے دوسرے کئی اخبارات میں اودھ پنچ کافی مقبولیت رکھتا ہے۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک اودھ پنچ نے ادب، صحافت اور طنز ومزاح میں قابل قدر خدمات انجام دیں کہ عوام کی کثیر تعداد نے ان اخبارات کے مطالعہ کو ترجیح دی۔

اودھ پنچ کا مقصد صرف اپنے طنز ومزاح سے لوگوں کو محظوظ کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اس سے لوگوں کی فکر کو بھی بیدار کرنا تھا۔ بقول پروفیسر سیدہ جعفر سیاست اور معاشرت ''اودھ پنچ'' کے دو میدان تھے۔ ان میں سیاسی اعتبار سے وہ ترقی پسند تھا تو معاشرتی اعتبار سے اسے قدامت پسند اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سرسید کے ذریعہ لائی ہوئی مغربی تہذیب کا یکسر مخالف تھا۔

انگریزی حکومت سے بیزاری، حکومت کے خلاف چلائی جانے والی مختلف عوامی تحریکوں کے

جوش وخروش نے اُردو صحافت کو استحکام بخشا۔

اودھ پنچ لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ اس لئے اس میں لکھنؤ کی عام زبان کا استعمال کیا گیا۔ تا کہ لوگ بہ آسانی ان باتوں کو سمجھ سکیں۔ اس طرح اودھ پنچ کے مقصد کی تکمیل ہو جائے۔ ابتداء میں اس کی صحافت پر ادب کا غلبہ رہا، اس لئے کہ اس کے صحافی پہلے ادیب کا درجہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ میں اپنے خیال اور قلم دونوں کا آزادانہ استعمال کیا۔ انھوں نے سیاسی، معاشی، ادبی، تعلیمی اور مذہبی موضوعات کو اودھ پنچ میں جگہ دی۔ لکھنؤ کی بگڑتی ہوئی تہذیب کو نہ صرف اس میں پیش کیا گیا بلکہ معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ لیکن محمد عبدالرزاق فاروقی تحریر کرتے ہیں :

"دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کی ادبی خدمات اودھ پنچ کے عہد کے لئے ایک قیمتی ورثہ ہیں جس کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم اودھ پنچ کے دور کا ادب نئے رجحانات اور نئے ماحول کا پروردہ تھا"۔[1]

فاروقی صاحب کے نظریئے کے مطابق ۱۸۵۷ء کے غدر نے جہاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی افکار پر اثر ڈالا، وہیں ادبی فکر کو بھی متاثر کیا۔ جس کے نتیجے میں دو مکتبِ خیال وجود میں آئے۔ ان میں ایک سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کا ہے تو دوسرا منشی سجاد حسین اور ان کے ہمنواؤں کا ہے۔

جہاں سرسید احمد اور ان کے رفقاء کو اُردو کے عناصر خمسہ کی حیثیت حاصل ہے، وہیں کشن پرشاد کول، منشی سجاد حسین اور ان کے ہم نواؤں کو اودھ پنچ کے نورتنوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اودھ پنچ کی شہرت اور مقبولیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں نہ صرف منشی سجاد حسین نے خود ہی مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا بلکہ انھوں نے اس دور کے بہترین اور کامیاب قلم کاروں کو یکجا جمع کیا۔ بقول پروفیسر احتشام حسین منشی سجاد حسین کے اخبار اودھ پنچ کو جو بہترین اور اعلیٰ قلم کار ملے وہ شائد ہی کسی اور اخبار کو ملے ہوں۔ ان میں ادیب اور شاعر دونوں ہی موجود تھے۔ اودھ پنچ سے وابستہ لکھنے والوں میں پنڈت تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی، اکبر الہ آبادی، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور پنڈت برج نارائن

---

[1] اودھ پنچ کی ادبی خدمات   محمد عبدالرزاق فاروقی   ص ۶۲

چکبست کے نام ملتے ہیں۔ جنھوں نے اس اخبار سے وابستہ ہو کر ہی اپنی پہچان کو مضبوط کیا جب کہ اس سے قبل وہ اُردو ادب میں اپنی انفرادی شناخت بنا چکے تھے۔ ان اہم شخصیتوں کے علاوہ عبدالحلیم شرر بھی ابتداء میں کچھ عرصے تک اودھ پنچ سے وابستہ رہے۔

پروفیسر فضل الرحمٰن اُردو انسائیکلوپیڈیا میں اس سے متعلق لکھتے ہیں :

''۱۸۷۷ء میں انگریزی پنچ کے نمونے پر منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ جاری کیا۔ یہ پرچہ سرسید، حالی اور نئے خیالات کے خلاف تھا اور مغربی تہذیب پر برابر طنز کرتا تھا۔ مگر سیاسی عقائد میں قوم پرست تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں کئی کہنہ مشق لکھنے والے تھے۔ اکبرالہ آبادی نے طنز و ظرافت کی وادی میں اس اخبار کے ذریعہ قدم رکھا''۔[1]

انگریزی پنچ کے نمونے پر منشی سجاد حسین نے پہلی بار اپنے اخبار میں مغربی ٹکنیک یعنی کارٹون کو اپنایا۔ ظریفانہ اسلوب اور کارٹون کی کارفرمائی نے اودھ پنچ کی مقبولیت میں قابل لحاظ اضافہ کیا۔

اُردو ادب ۱۹ویں صدی کے آغاز سے ہی مغربیت سے متاثر ہونے لگا تھا۔ اودھ پنچ کی یہی کوشش رہی کہ اُردو ادب کو مغرب پرستی سے بچائے رکھے۔

اس دور کا شائد ہی کوئی مسئلہ ایسا ہوگا جس پر اودھ پنچ میں مضامین نہ ملتے ہوں۔ انگریزی حکومت کی سیاسی، انگریزی تعلیم و تہذیب کو اودھ پنچ نے اپنی ظرافت کا نشانہ بنایا۔ یوں تو اُردو میں مزاح نگاری کے نام پر ہجو نگاری عام تھی لیکن اودھ پنچ میں منشی سجاد حسین نے ہجو کو اپنی تحریروں میں جگہ نہ دی بلکہ طنز و ظرافت سے کام لیا۔ جس طرح فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ اُردو نثر کا ایک بیش بہا سرمایہ جمع ہو گیا۔ اسی طرح اودھ پنچ کے ذریعہ اُردو میں طنز و ظرافت پر مبنی ادب کا اچھا خاصہ سرمایہ جمع ہو گیا اور اُردو میں مزاحیہ ادب کی روایت قائم ہوگئی۔ شائد ہی کوئی ایسا سیاسی مسئلہ ہوگا جسے ''اودھ پنچ'' نے نظر انداز کیا ہو۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے مسائل کو اپنے ظریفانہ انداز بیان سے پیش کیا۔

سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، ادبی، تہذیبی اور مذہبی تمام موضوعات کو منشی سجاد حسین نے

---

[1] اُردو انسائیکلوپیڈیا پروفیسر فضل الرحمٰن ص ۶۳

"اودھ پنچ" میں جگہ دی۔

منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء تا ۱۹۱۵ء

منشی صاحب کاکور کے متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ والد منشی منصور علی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور وظیفے پر سبکدوشی کے بعد حیدرآباد میں سیول جج کی حیثیت سے قیام کیا۔ سجاد حسین کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ تلاش روزگار میں وہ لکھنؤ سے فیض آباد آئے اور فوجیوں کو اُردو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ عہدۂ منشی کی مناسبت سے سجاد حسین کے نام سے شہرت پائی لیکن جلد ہی اس خدمت کو خیرباد کہا اور ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے ہفتہ وار پرچہ اودھ پنچ جاری کیا۔ محض اکیس سال کی عمر میں ایک معیاری پرچہ نکالنا اور بہترین اہل قلم کا حلقہ بنالینا ایک کارنامے سے کم نہیں۔

منشی سجاد حسین نے ایک صحافی کے علاوہ ناول نگار کی حیثیت سے بھی شہرت پائی۔ مزاج میں چوں کہ ظرافت تھی۔ ان کی ناولوں میں مزاحیہ انداز ملتا ہے۔ گو سجاد حسین نے اپنے مزاح سے اُردو ناول نگاری کو بھی آشنا کیا۔ لیکن ان کے مزاح میں پھکڑ پن نہیں ہوتا۔ سجاد حسین اپنی نثر میں تشبیہات، استعارات اور ضرب الامثال سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کی ناولوں میں "حاجی بغلول" ان کا مشہور ناول ہے۔ مورخین ادب کا خیال ہے کہ سجاد حسین کے ناول "حاجی بغلول" نے سرشار کے "فسانۂ آزاد" کی طرح شہرت پائی۔ اگرچہ اس ناول نے انھیں کافی مقبولیت عطا کی لیکن اودھ پنچ کی شہرت اس پر غالب آگئی۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۲ء

سرشار کا آبائی وطن کشمیر تھا لیکن انھوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت کی مروجہ زبانوں اُردو، عربی اور فارسی کے علاوہ لکھنؤ کے کینگ کالج میں انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کی مگر اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ بچپن میں سایۂ پدری سے محروم ہو جانے کے سبب تلاش روزگار کی فکر لاحق ہوئی۔ ضلع کھیری کے ایک اسکول میں مدرس کے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنی ضروریات کی تکمیل کی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ غدر نے ہندوستانیوں کے ضمیر کے بیدار ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ سارا ہندوستان انقلابی دور سے گذر رہا تھا۔ ہندوستانیوں کی اختراعی صلاحیتیں بھی جاگ اٹھی تھیں، رسالے نکلنے لگے

سرشار ابتداء ہی سے مضمون نگاری سے دلچسپی رکھتے تھے۔کشمیریوں کے رسالے"مراسلہ کشمیر" میں ان کے مضامین چھپنے لگے۔اس کے بعد ہفتہ وار اخبار "اودھ پنچ" جو اس وقت قبولِ عام کی سند حاصل کر رہا تھا، اس میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے۔تحریر میں انھوں نے قدیم انداز کے بجائے نیا انداز اپنایا۔اخبار کے مزاج کے مطابق سرشار نے بھی ظریفانہ مضامین لکھے اور رفتہ رفتہ اس دور کے کئی رسائل میں ان کے مضامین کی اشاعت عمل میں آئی۔

سرشار نے پہلی بار منشی نولکشور کی خواہش پر "اودھ اخبار" کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ جس سے نہ صرف اخبار کو مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ سرشار نے اپنی مایہ ناز تصنیف "فسانۂ آزاد" کا سلسلہ اسی اخبار میں قسط وار لکھا، جس میں لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کو پیش کیا ہے۔لکھنؤ کی تہذیب پر اپنے کئی مضامین میں اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔جن میں ایک مضمون "لکھنؤ کا چہلم" کے عنوان سے ملتا ہے۔

سرشار نے صحافی اور ناول نگار ہر دو طرح سے شہرت حاصل کی لیکن "فسانۂ آزاد" کو اُردو ادب میں خاص مقام ملا۔انھوں نے ترجمہ نگار کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

مرزا محمد مرتضیٰ نام لیکن اپنے عرفیت مرزا مچھو بیگ سے مشہور ہوئے۔شاعر اور نثر نگار تھے۔ شاعری میں عاشق تخلص کرتے، نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ان کی نثری اور شعری دونوں تصانیف ملتی ہیں۔ان کی تصانیف میں گلزارِ نجات، میلادِ شریف (منظوم)، آفتابِ قیامت (ظریفانہ نظم)، اُردو کا دیوان، مثنوی نیرنگ خیال کے علاوہ بہارِ نعت یا بہارِ پند وغیرہ شامل ہیں۔مزاج چوں کہ ظریفانہ پایا تھا جس کا اثر ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔زبان کی صفائی، محاوروں کا استعمال اور مزاج کی ظرافت ان کی تحریر کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔عرصۂ دراز تک ستم ظریف کے لقب سے ہی اخبار اودھ پنچ میں لکھتے رہے۔اودھ پنچ کے کچھ مضامین "چشم بصیرت" کے نام سے بھی شائع ہوئے۔کرمرا کے عنوان سے بھی ان کا ایک مضمون اودھ پنچ میں چھپا۔انھیں سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔کچھ عرصہ انڈین نیشنل کانگریس سے بھی وابستہ رہے۔

نواب سید محمد آزاد ۱۸۴۶ء ولادت

یہ ڈھاکہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آغا احمد علی اصفہانی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ سید محمد آزاد کی شناخت اس طرح بھی ہوتی ہے کہ مرزا قتیل کی لغت ''برہانِ قاطع'' کے سلسلے میں مرزا غالبؔ سے ان کی معرکہ آرائی رہی۔ غدر کے دوران مرزا غالبؔ نے برہان قاطع کا تنقیدی مطالعہ کیا اور اس کے جواب میں ''قاطع برہان'' تحریر کیا، جس پر اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی۔ سید محمد آزاد بھی اس معرکہ آرائی میں شامل رہے۔

انھیں انگریزی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ سب رجسٹرار اور انسپکٹر جنرل رجسٹرار کے عہدے پر فائز رہے۔ بنگال کی معزز شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

۱۹۱۲ء میں ملازمت ترک کردی اور فارسی میں مضمون نگاری کا آغاز کیا اور فارسی اخباروں میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے۔ بعدازاں اخبار ''اودھ پنچ'' اور دوسرے اخبارات اور رسائل میں اُردو مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔

صحافت سے وابستگی کے علاوہ آزاد نے ناول نگاری بھی کی۔ لکھنؤ کے نوابوں کا خاکہ اُڑانے میں ان کی ناول ''نوابی دربار'' بہت مشہور ہوئی۔ آزاد نے اودھ پنچ کے ظریفانہ مزاج کو ملحوظ خاطر رکھا ''نئی لغت'' ان کی دلچسپ تصنیف ہے۔

تربھون ناتھ ہجرؔ ۱۸۵۳ء تا ۱۸۹۲ء

ہجرؔ ادیب، شاعر اور وکیل کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے تھے۔ اس دور کی مروجہ زبانوں کے علاوہ کینگ کالج لکھنؤ میں انگریزی تعلیم پائی۔ مضمون نگار کی حیثیت سے اس دور کے دوسرے اخباروں کے علاوہ ''اودھ پنچ'' میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ ان کا طرزِ تحریر دلچسپ اور ظریفانہ تھا۔ ان کا مضمون ''دودو چونچیں'' اودھ پنچ میں شائع ہوا۔ جو عنوان ہی سے اپنی ظرافت کا ثبوت دیتا ہے۔ شاعری میں ہجرؔ تخلص کرتے تھے اور کچھ عرصہ پیشہ وکالت سے بھی وابستہ رہے۔

احمد علی شوقؔ ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۵ء

شوقؔ شاعر اور ادیب ہر دو طرح سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ اصناف سخن میں غزل اور

مثنوی دونوں ان کی پسندیدہ اصناف ہیں۔ سلیس نثر میں ان کے اودھ پنچ میں لکھے ہوئے مضامین کافی دلچسپ ہیں۔ اودھ پنچ میں شائع شدہ مضامین میں ان کا مضمون ''عشق کیا شئے ہے'' اچھے مضامین میں شمار ہوتا ہے۔

جوالا پرشاد برقؔ ۱۸۶۳ء تا ۱۹۱۱ء

برقؔ سیتاپور سے تعلق رکھتے تھے۔ ''اودھ پنچ'' سے وابستہ اور شخصیتوں کی طرح برق نے بھی کینگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۷۸ء میں برق نے بی۔اے کیا اور ہجر کی طرح قانون کی سند حاصل کی اور سیشن جج کے عہدے پر فائز رہے۔

برق ایک شاعر، ادیب اور مترجم کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں، ان کی مثنوی ''بہار'' کی اہمیت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ مصلح قوم اور جدید نثر کے بانی سرسید نے اس مثنوی کو بہت سراہا تھا۔

مترجم کی حیثیت سے برق نے کئی مشہور انگریزی ناولوں کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ ان میں بنکم چٹرجی کی ناولیں بھی شامل ہیں۔ یہ ترجمے اس قدر عمدہ ہیں کہ وہ تصانیف کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناولوں کے علاوہ شیکسپیئر کے ڈراموں کا بھی برق نے ترجمہ کیا۔ اودھ پنچ میں پیش کئے گئے مضامین ان کا ظریفانہ مضمون ''البرٹ بل'' کافی دلچسپ ہے۔

اکبر الہ آبادی ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء

سید اکبر حسین رضوی نام اکبر تخلص الہ آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری مدارس میں حاصل کی۔ مختاری کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے نائب تحصیلدار ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان کامیاب کیا اور سرکاری ملازم ہوگئے۔ ترقی کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں سب آرڈنیٹ جج اور ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۴ء میں جج کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ سرکار کی طرف سے خاں بہادر کا خطاب پایا۔

ادبی دُنیا میں شاعر، ادیب اور مصلح قوم کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔ مشرقی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ تھے۔ مغربی تعلیم و تہذیب سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مزاج نہایت ظریفانہ تھا

جس کا اثر ان کی نثر اور شاعری دونوں پر محیط رہا۔

ان کے کلام کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ صنف غزل، نظم اور رباعی پر طبع آزمائی کی۔ ابتدائی کلام تو قدیم روایت کا پابند ہے لیکن بعد میں اکبر کے کلام میں سیاست، مذہب اور تعلیم و تہذیب جدید تمام موضوعات شامل ہو گئے۔ قومی اصلاحات کو انھوں نے اپنا شعار بنایا۔ قدیم روایات اور تہذیب کی خوبیوں اور جدید تہذیب کی خامیوں پر طنز کرتے رہے۔ یہی سبب ہے کہ سرسید احمد خاں کے نظریات اور ان سے منسوب علی گڑھ تحریک کی سخت مخالف کرتے رہے۔ اکبر نے ایسا زمانہ پایا جس میں ہندوستانی مغربیت سے مغلوب ہو چکے تھے۔ سارے ہندوستان میں مغربی تہذیب اور کلچر کے چرچے تھے اور لوگ اسی کی تقلید کو اپنا فرض سمجھ رہے تھے۔

اکبر نے اپنی ساری صلاحیتوں، قابلیتوں اور ذہانت کا استعمال کرتے ہوئے قوم کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا۔ قوم کے درد کو اپنے سینے میں محسوس کرتے ہوئے کبھی ناصحانہ اور کبھی ظریفانہ انداز اختیار کیا۔ اپنے کلام یا تحریر میں طنزیہ طور پر انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کو خدشہ تھا کہ لوگ مغربی تعلیم حاصل کرتے ہوئے دین اسلام سے دور ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے سرسید پر نہ صرف طنز اور چوٹیں کی ہیں بلکہ سخت برہمی کا اظہار بھی کیا لیکن یہ اکبر کی زندگی کا المیہ ہے کہ ان کا لڑکا عشرت حسین عرف عشرتی نے لندن جا کر تعلیم حاصل کی۔ اپنی نظم میں لکھتے ہیں :

عشرتی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے ❊ کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی ❊ کیک کو چکھ کے سیوئیوں کا مزا بھول گئے

اخبار ''اودھ پنچ'' کی خدمات کا اعتراف اس وقت تک مکمل نہ ہو سکے گا جب تک اکبر الہ آبادی کا تذکرہ نہ ہو۔ اکبر اپنی شاعری یا اپنے کلام کے ذریعہ اخبار ''اودھ پنچ'' سے وابستہ ہوئے۔ اس سلسلے میں ان کی کئی نظمیں مشہور ہیں۔ ''جلوہ دربار دہلی'' اور ''برق کلیسا'' کا شمار اخبار کی مشہور نظموں میں ہوتا ہے۔ اودھ پنچ میں وہ الف ح (اکبر حسین) کے قلمی نام سے لکھا کرتے تھے۔

ان کے طنز و ظرافت میں شوخی کی آمیزش ہوتی، اسلوب سادہ اور عام فہم ہوتا، پرگوئی کے ساتھ زبان پر عبور حاصل تھا۔ اکبر نے اس دور میں خواتین کی بے پردگی، بے دینی اور مذہب بیزاری

پر لعن طعن کی ہے۔ خواتین کی بے پردگی سے متعلق ان کا مشہور قطعہ اس طرح ہے :

کل بے حجاب آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پر مردوں کی پڑ گیا

مشرقی تعلیم کی وقعت اور مغربی تعلیم سے نفرت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں :

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

سرسید پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

حاضر ہوا میں خدمت سید میں ایک رات — افسوس ہے کہ ہو نہ سکی کچھ زیادہ بات

بولے کہ تجھ کو دین کی اصلاح فرض ہے — میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

اکبر زندگی بھر ہندوستان کی آزادی کے لئے چلائی گئیں مختلف تحریکوں سے اتفاق اور سودیشی تحریکوں سے نفرت کرتے رہے۔ لیکن سرسید کے انتقال کے بعد ان کی قومی خدمات کا اکبر نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے :

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے — نہ بھولو فرق ہے جو کہنے والے کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر — خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اُردو کے بعض ادیبوں اور نقادوں نے اودھ پنچ کی خدمات کو سرسید یا علی گڑھ تحریک کی جوابی تحریک سے تعبیر کیا، جو ایک مقصد سے اُبھری لیکن علی گڑھ تحریک کے مقابلے میں اتنی دیرپا ثابت نہیں ہوئی لیکن اسے ایک مختصر سے عرصے میں ہی قبولِ عام کی سند مل چکی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سرسید تحریک کی سنجیدگی، متانت اور مقصدیت کے سبب لوگوں کے مزاج میں بھی خشکی در آئی تھی۔

ان حالات میں اودھ پنچ کے نثری اور شعری سرمائے نے لوگوں کے ذوق کو بڑی حد تک تسکین پہنچائی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ تحریر کرتے ہیں :

"سرسید تحریک نے ادب میں خوفناک متانت بلکہ خشکی و عبوست پیدا کی اور ایسی ہمہ گیر منطقیت اور استدلالیت کو رواج دیا جس کے زیر اثر عام طبائع میں

بڑی افسردگی پیدا ہوگئی تھی ۔ اودھ پنچ کی نیم سنجیدہ اور بعض اوقات بالکل
غیر سنجیدہ فضا نے اس کمی کو پورا کیا"۔[1]

بہر حال اُردو ادب کی تاریخ اودھ پنچ کے ذکر کے بغیر نامکمل رہ جائے گی کہ اودھ پنچ نے اپنی نثری اور شعری تخلیقات سے اُردو ادب کے سرمائے میں قابل لحاظ اضافہ کیا ہے۔

اُردو کا طنزیہ و مزاحیہ ادب

طنز و مزاح اُردو ادب کی کوئی صنف نہیں بلکہ یہ تحریر کا ایک انداز ہے جو نظم اور نثر دونوں میں برتا جاتا ہے۔ طنز اور مزاح دو الگ الگ الفاظ ہیں۔ طنز کے معنی طعنہ دینا، مزاح کے معنی ہنسی مذاق کے ہیں۔ ادب میں ان دونوں کا استعمال ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ طنز کے بغیر مزاح اپنا وزن و وقار کھو دیتا ہے اور مزاح کے بغیر طنز کے تیر و نشتر قبولیت کا درجہ نہیں پاتے۔

ماہرین ادب کی رائے میں طنز و مزاح کا آغاز مرزا محمد رفیع سوداؔ سے ہوا۔ لیکن ان کے ہاں ہجویہ پہلو نمایاں ہے۔ ان کی شہرت کا دارومدار ان کے قصیدوں اور ہجوؤں پر ہے۔ وہ جب کسی سے ناراض یا برہم ہو جاتے تو اس پر فوراً ہجو لکھ دیتے اور لوگ ان کی ہجو سے خوش ہوتے لیکن جس پر ہجو کے تیر چلائے جاتے وہ تڑپ اٹھتا۔

سید احتشام حسین اپنی تصنیف "اُردو کی کہانی" میں رقم طراز ہیں کہ جعفر زٹلی کے دور سے جو اورنگ زیب کا ہم عصر تھا طنز و مزاح کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اُردو ادب میں اس کے کئی رنگ اُبھرے اور ۱۹ ویں صدی کی آخری ربع صدی میں ہجو نگاری عام ہوئی۔

انشاء اللہ خاں انشاء کی شاعری میں بھی طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ تاریخ اُردو ادب کا ایک باب انشاءؔ و مصحفیؔ کے عہد سے موسوم ہے۔ ان دونوں میں جو شاعرانہ چشمکیں چلتی رہتیں، اس میں صاف طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ان دونوں نے حدِ ادب کا خیال نہ رکھا۔

جی چاہتا ہے شیخ کی پگڑی اُتاریئے　　　اور تان کر چٹاخ سے اک دھول ماریئے

---

[1] اُردو ادب کی ایک صدی　ڈاکٹر سید عبداللہ　ص ۶۷

سوداؔ اور انشاءؔ کے کلام میں طنز و مزاح کے نمونے ملتے ہیں جب کہ مرزا غالبؔ کے خطوط میں شوخی وظرافت پائی جاتی ہے۔ خصوصیت سے ان کے خطوط ادبی لحاظ سے شوخی وظرافت کی اہم ترین مثال ہوں گے۔ مرزا غالبؔ طبعاً رنگین مزاج تھے۔ شائد اس لئے حالیؔ نے انھیں حیوانِ ظریف کہا تھا۔ طبیعت کی شوخی اور رنگینی سے ان کا کلام بھی مملو ہے۔

ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش رہی ایک دن	دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے	گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی

اخبار ''اودھ پنچ'' سے اُردو میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اودھ پنچ سے متعلق ایک عام نظریہ یہی ہے کہ یہ سرسید کی تحریک کی تردید کے طور پر اُبھرا۔ اس اخبار کے تحت ادیبوں نے اسے اصلاحی مقصد کے تحت بھی اپنایا۔ سماج کی اصلاح اور ان میں مغربی تعلیم وتہذیب سے نفرت پیدا کرنے کے لئے انھوں نے ناصحانہ اور واعظانہ انداز کو اپنانے کے بجائے طنز وظرافت کا سہارا لیا تاکہ لوگوں کو ناگواریٔ طبع کے بغیر ان کا مقصد حاصل ہو جائے۔ اودھ پنچ سے وابستہ کئی فن کاروں کے ساتھ ساتھ اکبر الہ آبادی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اکبر نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ نظموں اور رباعیات سے اودھ پنچ میں حصہ لیا۔

اودھ پنچ کا یہ کاروان ظرافت جو اکبر کے علاوہ سرشار، مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق اور احمد علی شوق پر مشتمل تھا منشی سجاد حسین کی سرکردگی میں آگے بڑھتا رہا۔

اُردو صحافت میں اودھ پنچ کے بعد طنزیہ و مزاحیہ ادب کے ذریعے جن اہل قلم حضرات نے شہرت پائی ان میں ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، مولوی محفوظ علی، ولایت علی بمبوقؔ، محمد علی، سند باد جہازی اور لق لق کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ہی اصحاب کے شانہ بہ شانہ ادبی مزاح نگاری میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کے نام ملتے ہیں۔ ان کے بعد عظیم بیگ چغتائی، ملا رموزی، شوکت تھانوی نے طنز و مزاح میں پایۂ اعتبار حاصل کیا۔ امتیاز علی تاج نے اگرچہ ڈرامہ انارکلی کے سبب شہرت حاصل کی لیکن ''چچا چھکن'' ان کی مزاحیہ تصنیف ہے۔ جن میں وہ چچا چھکن کے تصویر

ٹانگنے کے واقعہ کو اس قدر دلچسپ اور پرلطف انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کے قہقہے بلند ہو جاتے ہیں۔

کنھیا لال کپور بیسویں صدی کے طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ کپور نے اپنے افسانوں میں طنزیہ و مزاحیہ انداز کو اپنایا ہے۔

فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۳ء تا ۱۹۴۷ء

یہ دہلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم یہیں پر حاصل کی۔ ہندو کالج سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے۔ یہاں کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۳۲ء سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ مختلف موضوعات کے علاوہ تنقید، سماجی اصلاح، سوانح اور افسانہ پر طبع آزمائی کی۔ دہلی کی ٹکسالی زبان میں لکھتے رہے۔ ان کی تحریریں سنجیدگی پر مبنی ہوتیں اور مزاحیہ انداز پر بھی۔ لیکن مزاحیہ اسلوب نے قبولِ عام کی سند حاصل کی۔

دہلی کے روزمرہ اور محاوروں کا برجستہ استعمال ان کے مضامین کو پرلطف بنا دیتا ہے۔ ان کا مزاح نہایت لطیف ہوتا جسے پڑھ کر قاری قہقہہ تو نہیں لگاتا بلکہ متبسم ضرور ہوتا گویا فرحت اللہ کے مضامین قاری کو فرحت بخشتے ہیں جب کہ ان کے علمی و ادبی رنگ پر مشتمل مضامین میں مزاح، سنجیدگی اور متانت کا پہلو بھی شامل ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے مزاحیہ مضامین کے کل سات مجموعے "مضامین فرحت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "دہلی کا آخری مشاعرہ" ان کا اہم مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد کے ایک مشاعرے کی روداد پیش کی ہے، جس میں اس عہد کے نامور اور بلند پایہ شعراء نے شرکت کی تھی۔

فرحت اللہ بیگ خاکہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ انھوں نے "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی" کے عنوان سے لکھا۔ اس میں وہ اپنے استاد مولوی نذیر احمد کی طرح واقعہ کی تفصیلات اور جزئیات نگاری کے ماہر نظر آتے ہیں۔ مزید انھوں نے وحید الدین سلیم کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کے مضامین میں مزاح کا انحصار واقعات یا کرداروں پر نہیں بلکہ ان کے اسلوب پر ہوتا ہے۔ سماجی اصلاح کے دوران وہ ناصحانہ انداز کی ناگواری کو بھی

اپنے اسلوب سے خوشگواری سے بدل دیتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی ۱۸۹۶ء تا ۱۹۷۷ء

ان کا تعلق جونپور کے دیہات مرلیا سے ہے۔ان کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں ہوئی۔ ابتداء میں ان کے معاشی حالات نے انھیں کچھ کام کرتے ہوئے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کردیا۔ لیکن مسلم یونیورسٹی سے ایم-اے کرنے کے بعد وہ اسی یونیورسٹی میں ۱۹۲۳ء میں شعبۂ اُردو کے لکچرر مقرر ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبۂ ہو گئے۔علی گڑھ یونیورسٹی سے بلکہ خود علی گڑھ سے انھیں کافی انسیت اور ایک جذباتی لگاؤ تھا۔

طالبِ علمی کے دور سے ہی رشید احمد نے میدانِ ادب میں قدم رکھا اور ان کی انشاء پردازی کے چرچے ہونے لگے۔ان کا شمار ایسے اساتذہ میں ہوتا ہے جنھوں نے نہ صرف طلباء کو زبان وادب کی خدمت کرنے کا درس دیا بلکہ عملی طور پر خود بھی اس کا مظاہرہ کیا۔

رشید احمد صدیقی کی تحریر سے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں علی گڑھ کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے۔دراصل رشید احمد صدیقی نے اپنی عمر کا قابل لحاظ حصہ علی گڑھ میں بسر کیا اور یہاں سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔علم،عہدہ،عزت اور شہرت سب کچھ انھیں علی گڑھ سے ملی چنانچہ علی گڑھ سے ان کا گہرا لگاؤ اور محبت فطری تھی۔علی گڑھ کے مقامی رنگ کے باوجود ان کے مضامین قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتے۔

رشید احمد کے مضامین میں طنز و مزاح کا امتزاج ملتا ہے۔ان کے مضامین میں بلند پایہ طنز و ظرافت ہوتی ہے۔جس سے تعلیم یافتہ طبقہ یا عام طبقہ بھی لطف اُٹھا سکتا ہے گو ان کی تحریریں ایک عام قاری کے فہم سے بالاتر ہوتی ہیں۔سیاست،تاریخ اور مخصوص واقعات سے جانکاری رکھنے والا ہی ان کی تحریروں سے صحیح طور پر لطف اندوز ہوسکتا ہے۔فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال ان کی عبارت کو مزید معیاری بنا دیتا ہے۔

''مضامین رشید''،''خنداں''،''گنج ہائے گراں مایہ''،''ہم نفسانِ رفتہ''،''آشفتہ بیانی میری''اور''طنزیات و مضحکات''ان کی مشہور و مایہ ناز تصانیف ہیں۔

پطرس بخاری ۱۸۹۸ءتا۱۹۵۸ء

اصل نام احمد شاہ بخاری تھا۔ پشاور میں پیدا ہوئے۔ پطرس بخاری کے قلمی نام سے شہرت پائی۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کی بعدازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۶ سال تک کیمرج یونیورسٹی میں تعلیم پاتے رہے۔ اپنی خداداد ذہانت کے سبب لاہور کالج اور کیمرج یونیورسٹی میں اپنا مقام بنایا۔ انگلستان سے واپس آکر وہ انگریزی ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو میں اسسٹنٹ کنٹرولر اور پھر کنٹرولر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کل سات سال تک اس عہدے پر رہ کر اپنی اعلیٰ ذہانت، قابلیت وصلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے لئے بیرونی ممالک کا دورہ کرتے رہے لیکن ۱۹۵۵ء میں پطرس بخاری کو اقوام متحدہ (U.N.O) کے شعبۂ اطلاعات کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ یہ پطرس بخاری کے لئے ہی نہیں بلکہ اُردو دُنیا کے لئے کچھ کم شرف نہ تھا۔

پطرس بخاری بنیادی طور پر انگریزی ادیب تھے لیکن مادری زبان سے بھی دلچسپی ہونے کے سبب انھوں نے اُردو میں مزاحیہ مضامین لکھے۔ فرحت اللہ بیگ کے برخلاف پطرس کا مزاحیہ اسلوب محض مزاح کی حد تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ واقعات اور کرداروں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ پطرس نے ایک صحت مند مزاح نگاری کے رجحان کو بڑھاوا دیا ہے۔

کچھ ناقدین کا کہنا ہے کہ ان کی مزاح نگاری پر مغربیت کا اثر غالب ہے۔ یہ بات کچھ افسانوں پر صدفی صد صادق آتی ہے۔ ان کا مزاح صرف لطف اندوزی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مزاح سے اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں۔ سیدھے سادھے جملوں کو بھی وہ مزاحیہ رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔

اپنے افسانوں میں پلاٹ، کردار، سیرت نگاری اور منظر نگاری اس انداز سے پیش کرتے کہ یہ حقائق سے منہ نہیں موڑتے۔ انسانی کمزوریوں کے اظہار سے ہنسنے کا موقعہ فراہم کرنا ان کا مقصد نہیں بلکہ ان کمزوریوں کو دور کرنا ان کا مقصد ہوتا ہے۔

ان کا ادبی سرمایہ زیادہ نہیں۔ محض ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''مضامین پطرس'' کے نام

سے ملتا ہے لیکن یہ مجموعہ اُردو ادب میں قابل قدر حیثیت کا حامل ہے۔ ''کتے''، ''مرید پور کا پیر''، ''میں ایک میاں ہوں''، ''سویرے جو کل میری آنکھ کھلی'' ان کے مشہور مضامین ہیں جو مختلف جماعتوں کے نصاب میں شامل کئے گئے۔

عظیم بیگ چغتائی ۱۸۹۵ء تا ۱۹۴۱ء

یہ جودھپور سے تعلق رکھتے تھے۔ یہیں سے تعلیم حاصل کی۔ جودھپور کی قابل اور تعلیم یافتہ شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جودھپور میں وہ چیف جسٹس کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ طالب علمی کے زمانے سے مضامین لکھنے کا شوق تھا، جس کے بعد افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ ان کے مزاحیہ افسانوں کی دلکشی اور دلچسپی کا باعث ان کا پلاٹ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار فعال اور حرکیاتی ہوتے ہیں۔ عمر کے ہر دور سے تعلق رکھنے والا کردار ان کے ہاں موجود ہے۔ چغتائی بھی مزاحیہ افسانوں کے ذریعہ معاشرے کے اصلاح چاہتے ہیں۔ انسان کی عملی زندگی جن مراحل یا منازل سے گزرتی ہے ان تمام موضوعات کو عظیم بیگ نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے مثلاً شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ۔

عظیم بیگ کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے۔ وہ سنجیدہ موضوعات پر اپنا قلم اُٹھاتے ہیں۔ ''قرآن اور پردہ'' کے عنوان پر بھی ان کی کتاب ملتی ہے، انھوں نے مزاحیہ اور سنجیدہ دونوں طرز میں افسانے لکھے ہیں۔ ان کے ہاں ایسے افسانے بھی ملتے ہیں جو غم واندوہ پر مبنی ہیں لیکن ان کی شہرت مزاحیہ افسانوں سے زیادہ ہوئی۔ اپنے افسانوں میں انھوں نے زبان اور محاوروں پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ ان کے افسانوں میں ''شریر بیوی''، ''کولتار'' اور ''خانم'' کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

مُلّا رموزی ۱۸۹۶ء تا ۱۹۵۲ء

یہ بھوپال سے تعلق رکھتے تھے۔ اصلی نام صدیق ارشاد تھا۔ مُلّا رموزی کا قلمی نام اختیار کیا۔ مدرسۂ الٰہیات کانپور سے درس لیا۔ اسی دوران انھوں نے مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔ تعلیم ختم کر کے ۱۹۱۸ء میں جب بھوپال آئے تو یہ سلسلہ اور بھی تیزی سے چلنے لگا۔ اپنے افسانوں میں انھوں نے زیادہ تر ملک کی سیاست کو موضوع بنایا۔ اپنی ساری توجہ سیاسی مسائل پر صرف کردی۔ چنانچہ کئی

اخباروں کے ایڈیٹر بھی ہوئے۔

ملّا رموزی شاعر، مقرر اور مدرس کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''گلابی اُردو'' کے نام سے شائع ہوئی۔ جملوں میں الفاظ کے بے ترتیب استعمال کو وہ گلابی اُردو سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ قوم کے سچے، ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ قوم کی کمزوریوں کو وہ اپنے مخصوص انداز سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ اُردو کے گلابی انداز کو کچھ عرصہ اپنانے کے بعد وہ سیدھی سادھی اور روزمرہ زبان میں لکھنے لگے۔ ان کی بھی کئی تصانیف ملتی ہیں۔ مزاح سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ اپنے ناصحانہ اور اصلاحی کام بھی وہ مزاحیہ انداز سے لے لیتے تھے۔ لوگ ان کے مضامین پڑھ کر ہنستے ہوئے ان کی باتوں پر سنجیدگی سے سوچنے لگتے۔

شوکت تھانوی ۱۹۰۴ء تا ۱۹۶۳ء

ان کا نام محمد عمر تھا۔ تھانہ سے تعلق رکھتے تھے، اسی مناسبت سے تھانوی کہلائے۔ شوکت تھانوی کے قلمی نام سے انھوں نے ادبی دُنیا میں خوب شہرت حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ شوکت نے زیادہ تعلیم حاصل نہ کی۔ کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر تھانہ سے بھوپال اور پھر لکھنؤ منتقل ہوئے۔ لکھنؤ ان کی شخصیت کو اُبھارنے میں بڑا مددگار ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ ملک کے ایک نامور مزاح نگار کہلانے لگے۔ ان کے مضامین مختلف اخباروں میں چھپنے لگے۔ ہندوستان اور پاکستان ہر دو مقامات پر وہ ریڈیو سے اس طرح وابستہ رہے کہ ان کے مزاحیہ مضامین ریڈیو سے نشر ہوتے۔

شوکت تھانوی میں مزاح نگاری کا فطری ملکہ موجود تھا۔ کسی خاص موضوع کو عنوان نہیں بناتے بلکہ روزمرہ زندگی کی معمولی معمولی باتوں پر طنز کرتے ہیں۔ ان کا مزاح واقعات کا نہیں بلکہ الفاظ کا مزاح ہوتا ہے۔ ''سودیشی ریل'' ان کا مشہور مزاحیہ مضمون ہے جسے کافی شہرت حاصل ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ افسانہ ''لکھنؤ کانگریس سیشن'' نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔ دلکش اندازِ بیان، سادہ اور عام فہم الفاظ اور بے ساختہ پن ہی ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں جو ان کی تحریر میں جان ڈال دیتی ہیں۔

شوکت تھانوی کی تصانیف کے نام اس طرح ہیں: ''موج تبسم''، ''بحر تبسم''، ''سیلاب تبسم''

اور ''طوفانِ تبسم'' جن کے نام سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا قاری تبسم سے بچ نہیں سکتا۔ شوکت کا اندازِ بیان انھیں متبسم ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شوکت تھانوی نے شاعری بھی کی۔ ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ ''گہرستان'' کے نام سے شائع ہوا۔ تاہم شاعر کی حیثیت سے انھیں کوئی شہرت حاصل نہ ہوئی۔ ''شیش محل'' بھی ان کی تصنیف ہے جس میں ان کے لکھے ہوئے سوانحی مرقع ملتے ہیں۔

کنھیالال کپور ۱۹۱۰ء تا ۱۹۸۰ء

یہ ضلع لائل پور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ ایم۔ اے کامیاب کرنے کے بعد لاہور میں ہی انگریزی کے لکچرر مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد لاہور سے فیروز پور منتقل ہوئے اور یہیں ایک کالج میں خدمت انجام دینے لگے۔

کپور اُردو ادب میں ایک کامیاب طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے شائد ہی کسی موضوع پر اپنا قلم نہ اُٹھایا ہو۔ سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی ہر شعبۂ حیات کو کپور نے اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی زبان سیدھی سادھی لیکن دلچسپ ہوتی ہے۔ انگریزی کے لکچرر تھے، جس کا اثر اُردو ادب میں بھی ملتا ہے۔ ہر شعبے کی خامیوں یا فرد و سماج کی خامیوں کو وہ بے لوث انداز میں سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کا یہی انداز قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ان کے مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''سنگ و خشت''، ''چنگ و رباب''، ''نوکِ نشتر''، ''شیشہ و تیشہ'' وغیرہ اُردو ادب میں کافی مشہور ہوئے۔ ''غالب جدید شعراء کی محفل میں'' ان کا بہترین مزاحیہ مضمون ہے۔ اس کے علاوہ کئی مضامین نصابی کتب کی زینت بن چکے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں کو اپنی شگفتگی اور شوخی سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سماج کی چھوٹی سے چھوٹی خامی کا خواہ وہ علمی ہو یا ادبی بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہوئے کپور اسے منظر عام پر لاتے ہیں۔

کسی بھی طرح کی خامی کو منظر عام پر لانے کا مقصد صرف ہنسنا یا ہنسانا نہیں ہوتا بلکہ کپور چاہتے ہیں کہ اس کی اصلاح ہو جائے۔

کپور نے سنجیدہ مضامین بھی لکھے اور افسانے بھی لیکن ان کی شہرت مزاح نگار کی حیثیت سے

ہی ہوئی ۔ان کے مزاحیہ مضامین پیروڈی کی حیثیت سے بھی شناخت رکھتے ہیں ۔ان کے علاوہ ابراہیم جلیس، شفیق الرحمٰن، فکر تونسوی اور فرقت کاکوری کے نام مزاح نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں کہ ان مزاح نگاروں نے آزادی سے پہلے اُردو کے مزاحیہ ادب میں اپنی شناخت بنائی ہے۔ان میں کئی نام ایسے ہیں جن کی مزاحیہ تصانیف آزادی سے پہلے ہی منظر عام پر آچکیں تھی لیکن آزادی کے بعد بھی ان کے قلم نے اپنا سفر جاری رکھا۔فکر تونسوی تو حالیہ عرصے تک لکھتے رہے۔

آزادی کے بعد طنز ومزاح

آزادی کے بعد بھی طنز ومزاح نگاروں کا کارواں رواں رہا اور کئی مزاح نگاروں نے اپنی اپنی تصانیف پیش کیں ۔ان میں ابن انشاء، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا، برق آشیانوی، پرویز یداللہ مہدی، مسیح انجم، وجاہت علی سندیلوی، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر کے علاوہ اور کئی نام ملتے ہیں ۔ان مزاح نگاروں نے اُردو نثر میں اپنی مزاح نگاری کے نمونے پیش کئے ہیں۔

ابن انشاء

ابن انشاء کے سفرنامے اُردوادب میں کافی مقبولیت کے حامل ہیں ۔ابن انشاء نے اپنے مزاج کی شوخی وظرافت کو اپنے سفرناموں میں سمویا ہے۔میر کے آدھے مصرعے کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ابن انشاء نے اپنے سفرنامے کا عنوان اس طرح بنایا ہے''چلنا ہو تو چین کو چلئے'' سے ان کے مزاج کی ظرافت جھلکتی ہے۔اس کے علاوہ ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں''، ''آوارہ گردی کی ڈائری'' اور ''دُنیا گول ہے'' ان کے طنز ومزاح سے بھرپور سفرنامے ہیں جو دلچسپی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی بھی اس دور کے مزاحیہ ادیبوں میں اپنی شناخت رکھتے ہیں ۔ان کی تصانیف ''چراغ تلے''، ''خاکم بدہن'' اور ''زرگذشت'' ہیں، یہ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں ۔ان کے کئی مضامین مختلف جماعتوں کے نصاب میں شامل کئے گئے ہیں ۔اپنے مضامین میں وہ واقعات سے زیادہ اپنی طرزِ تحریر سے شوخی پیدا کرتے ہیں ۔وہ اپنے مضامین میں دوسری زبانوں کے

مطالعہ سے استفادہ کرتے ہوئے مضامین کو مزید عالمانہ بنا دیتے ہیں۔ان کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ موقعہ ومحل کی مناسبت سے ان مصرعوں کا بخوبی استعمال کر لیتے ہیں، جنھیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر نے اسی موقع کے لئے وہ مصرعہ کہا تھا۔

یوسف ناظم

یوسف ناظم بھی عہدِ حاضر کے مزاح نگاروں میں اُونچا مقام رکھتے ہیں۔ان کا طنز کاری اور مزاح بھی پر لطف ہوتا ہے۔طنز کے کاری ضرب کا زخم مزاح سے مندمل ہو جاتا ہے لیکن قاری کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ان کے بھی کئی مضامین نصابی کتب کی زینت بن چکے ہیں۔ان کے اکثر و بیشتر مضامین اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔

اپنے مضمون ''ذرا مسکرایئے'' میں انھوں نے عہد حاضر میں فوٹو گرافی کے رواج پر راست طنز کیا ہے جو جنون کی حد تک لوگوں کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ان کی مزاحیہ تصانیف میں ''زیرِ غور''، ''سائے اور ہمسائے''، ''فٹ نوٹ'' شامل ہیں۔

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین کو ابتداء میں اخبار سیاست کے کالم ''شیشہ و تیشہ'' کے سبب کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔یہ روز نامہ سیاست سے صحافی کی حیثیت سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۶۲ء سے مزاح نگاری کا آغاز کیا۔مجتبیٰ حسین بھی اپنی تحریروں میں اپنے مخصوص انداز سے مزاح پیدا کرتے ہیں کہ قاری نہ صرف مسکرا اُٹھتا ہے بلکہ قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ان کی مزاح نگاری میں نفاست اور شائستگی ملتی ہے۔مجتبیٰ حسین خاکہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

''آدمی نامہ'' ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''تکلف برطرف''، ''قصہ مختصر''، ''قطع کلام''، ''آخر کار'' وغیرہ ہیں۔

ان کا ایک مضمون ''چار مینار اور چار سو برس'' کے عنوان سے ملتا ہے جس میں انھوں نے چاروں میناروں کی باہمی گفتگو بیان کرتے ہوئے ان ہی کی زبانی حیدر آباد کی قدیم تہذیب پر روشنی ڈالی ہے اور اسے سراہتے ہوئے جدید تہذیب پر طنز کرتے ہیں۔ان چاروں میناروں کی باہمی گفتگو

اوران کی ایک دوسرے سے مخاطبت کو مصنف ایسے مزاحیہ انداز میں پیش کرتا ہے کہ بے ساختہ قاری کے قہقہے بلند ہو جاتے ہیں۔

بہرحال آزادی کے بعد جتنے بھی مزاح نگار منظر عام پر آئے، ان میں سے کچھ مزاح نگاروں نے واقعات کے ذریعہ مزاح پیدا کیا ہے تو کچھ نے اپنے شگفتہ اسلوب سے قارئین کو محظوظ کیا ہے۔ کسی کے طنز پر مزاح غالب آ گیا تو کسی کے مزاح پر طنز کی کارفرمائی رہی۔ اس طرح یہ طنز و مزاح کا کارواں رواں رہا۔

نثر کی طرح شاعری میں بھی طنز و مزاح کی روایت آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد دونوں ادوار میں ملتی ہے۔ راجہ مہدی علی خاں، ظریف لکھنوی، جوش ملیح آبادی، سرور ڈنڈا اور شاد عارفی وغیرہم آزادی سے پہلے سے لکھتے رہے ہیں۔ آزادی کے بعد جن لوگوں نے اس میدان میں اپنی شناخت بنائی، ان میں دلاور نگار، رضا نقوی واہی، طالب خوندمیری، اسماعیل ظریف، بوگس حیدرآبادی اور سراج نرملی کے علاوہ اور کئی نام ملتے ہیں۔

ساتواں باب

اصنافِ نثر

کسی بھی زبان کا ادب نظم ونثر دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ نظم اور نثر ہر دو اپنی کئی اصناف پر مشتمل ہیں ۔ جلد اول میں اصنافِ نظم یا اصنافِ شاعری کا تفصیلی تعارف کیا جاچکا ہے۔ اُردو نثر کی تاریخ میں قدیم وجدید تمام نثری اصناف کا تعارف ناگزیر ہے۔ نثری اصناف کے تعارف کے دوران طلباء کی سہولت کے پیش نظر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اختصار اور جامعیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ کیوں کہ تاریخ کی ان دونوں جلدوں کی تصنیف کا مقصد ہی طلباء کو سہولت بہم پہنچانا ہے۔

اُردو نثر بھی ہیت اور مواد کے لحاظ سے کئی اصناف پر مشتمل ہے۔ جیسے داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، مضمون نگاری، سوانح نگار اور خطوط نگاری وغیرہ ان کے علاوہ تذکرہ نگاری، خاکہ نگاری، آپ بیتی، رپورتاژ، سفرنامہ، انسائیکلو پیڈیا یا قاموس اور صحافت بھی نثری اصناف کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو نثر کی تحریر کے کئی طرز یا اسلوب بھی ہیں۔ تحقیق، تنقید، تاریخ، تمثیل، طنز ومزاح (ظرافت) جس کے تحت پیروڈی بھی آجاتی ہے۔ تحریر کے مختلف اسالیب انھیں کے سبب اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ اُردو زبان کے آغاز وارتقاء سے متعلق یہ حقیقت منظر عام پر آچکی ہے کہ اُردو زبان کا آغاز تقریباً ۱۰۰۰ء میں شمالی ہند میں ہو چکا اور جب یہ زبان اپنے بولنے والوں کے ہمراہ مسافت طئے کرتی ہوئی جنوبی ہند پہنچی تو اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ نظم اور نثر کے تقریباً تمام اصناف میں اپنی جولانی دکھانے لگی۔

داستان

داستان کے معنی قصہ یا کہانی کے ہیں۔ لفظ کہانی سے کرداروں کا تصور یقینی ہے۔ اس میں قصہ در قصہ یا کہانی در کہانی بیان کی جاتی ہے۔ ایک کہانی جہاں پر ختم ہوتی ہے وہیں سے دوسری کہانی

کا آغاز ممکن ہے۔ ہر کہانی ایک عنوان کے تحت بیان کی جاتی ہے۔ کبھی یہ کہانیاں باہمی ربط رکھتی ہیں اور کبھی ہر کہانی اپنا انفرادی وجود رکھتی ہے۔ اس میں عام طور پر فوق الفطرت عناصر کا بیان ملتا ہے اور ایک خیالی دُنیا کا تصور ہوتا ہے۔ اس طرح داستان حقیقت سے بعید ہوتی ہے۔ اس کے قصے زمانہ حال سے زیادہ ماضی کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر عشقیہ مضامین کو بیان کیا جاتا ہے لیکن فوق الفطرت عناصر اور عشقیہ موضوع اس کا لازمہ نہیں ہوتے۔ خطرناک مہمات اور حادثات کو بھی داستان میں بیان کیا جاتا ہے۔

داستان چوں کہ کئی صفحات پر مشتمل ہوتی ہے، اس لئے اس میں فوق الفطرت عناصر کے بیان اور خیالی دُنیا کے تصور کے ذریعہ قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ داستان ادب برائے ادب کی عمدہ مثال ہے۔ عموماً اس کا انسان کی روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

داستان اُردو کی قدیم ترین صنف ہے۔ جب سے انسان کی سماجی زندگی کا تصور ملتا ہے اسی وقت سے کہانیوں کا وجود ملتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ صنف ہے۔ ادب میں اس کے رواج پانے کی وجہ یہی ہے کہ انسان فطرتاً کہانی سننے یا پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ داستان کے لکھنے کا مقصد ہی اخلاقی درس یا خیر وشر کے ٹکراؤ کے نتائج کو پیش کرنے سے زیادہ قاری کو محظوظ اور لطف اندوز کرنا ہوتا ہے۔

داستان صرف ہندوستان یا اُردو کی ہی صنف نہیں بلکہ ہر ملک اور ہر زبان میں اس کا وجود ملتا ہے۔ داستان کا آغاز بھی دوسری اصناف کی طرح عربی میں ہوا کہ عرب میں داستان گوئی کا رواج تھا۔ عربی سے یہ صنف فارسی زبان میں آئی اور فارسی سے اُردو زبان میں رواج پائی۔ کہانی کے بیان کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ اس کی سب سے قدیم شکل حکایت ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ انگریزی میں حکایت کو fable کہتے ہیں۔

کہانی کی دوسری شکل تمثیلی کہانی یا legend ہے۔ حکایت اور تمثیل دونوں ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ اس کا مقصد بھی اخلاق وجذبات کی اصلاح ہوتا ہے۔ تمثیل میں غیر ذی روح اشیاء کو کرداروں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ دکنی میں ملا وجہی کی مایہ ناز تصنیف ''سبرس'' اس کی عمدہ مثال ہے۔ سبرس کے کرداروں سے متعلق پروفیسر سیدہ جعفر تحریر کرتی ہیں :

''سب رس کے کردار حسن، عشق، دل، غمزہ، ناز، زلف، رخسار اور نظر اسم
با مسمیٰ ہیں اور ان کے ناموں سے ان کے صفات کا اظہار ہوتا ہے وجہی نے
مختلف کیفیات کو کردار کا روپ عطا کرتے ہوئے بڑی ژرف نگاہی، جودت
طبع اور ادبی ذکاوت سے کام لیا''۔[1]

قصے کے اہم کردار عقل، دل، عشق اور حسن ہیں جس کی وضاحت یہ ہے کہ شہر بدن کے بادشاہ کا نام ''عقل'' ہے اس کا شہزادہ ''دل'' ہے اور ''عشق'' شہر دیدار کا بادشاہ ہے، ''حسن'' اس کی شہزادی ہے۔ فارسی زبان میں یہ قصہ ''قصہ حسن و دل'' کے نام سے اپنی شناخت رکھتا ہے۔ وجہی نے یہ قصہ ضرور فارسی زبان سے مستعار لیا لیکن اپنی طبیعت کی جولانی سے اسے مزید دلچسپ بنا دیا۔

کہانی کی ایک اور شکل رومانی کہانی ہے۔ انگریزی کے لفظ Romance کو اُردو میں ''رومان'' کہا گیا۔ داستان رومانی کہانی کی تعریف پر پوری اُترتی ہے۔ اس میں خیالی دُنیا کا بیان، مافوق الفطرت عناصر، حسن و عشق کی چاشنی اور واقعات کی کثرت کے ساتھ ساتھ اندازِ بیان کی لطافت بھی ہوتی ہے۔ داستان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا اندازِ بیان دلچسپ اور متاثر کن ہوتا ہے تا کہ قاری از حد محظوظ ہو اور داستان کے اختتام تک اس کا انہماک برقرار رہے۔ عشق و محبت کے واقعات سے قاری جہاں لطف اندوز ہوتا ہے، وہیں مہمات اور حادثات سے اس کے تجسس، حیرت اور استعجاب میں اضافہ ہوتا ہے۔

''اصناف ادب اُردو'' کے مولفین ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق اکثر قصے اور داستانیں پہلے سنسکرت زبان میں لکھی گئیں۔ ہندوستان سے یہ داستانیں عرب و ایران گئیں جہاں ان کا ترجمہ عربی و فارسی زبان میں ہوا۔ بعد ازاں عربی و فارسی کے توسط سے وہ اُردو میں رائج ہوئیں۔ جیسے ''بیتال پچیسی''، ''کلیلہ و دمنہ''، ''سنگاسن بتیسی''، ''طوطا کہانی'' اور گل بکاولی وغیرہ۔ ان میں بجز ''کلیلہ و دمنہ'' سب ہی داستانیں مختصر داستانوں کی فہرست میں شمار ہوتی ہیں۔

عربی و فارسی سے جن داستانوں کا ترجمہ اُردو زبان میں ہوا ان میں ''الف لیلیٰ'' اور بہار

[1] تاریخ ادب اُردو ۱۷۰۰ء تک جلد چہارم پروفیسر سیدہ جعفر - پروفیسر گیان چند جین

کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ داستانیں ابتداءً عرب و ایران میں ہی لکھی گئیں تھیں۔ ہندوستان میں ابتداءً فارسی زبان میں لکھی جانے والی داستانوں میں ''طلسم ہوش ربا'' چہار درویش کے نام ملتے ہیں ''چہار درویش'' جس کا ترجمہ ''باغ و بہار'' کے نام سے ہوا۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کی کتاب ''فسانۂ عجائب'' کا شمار اُردو کی طبع زاد داستانوں میں ہوتا ہے۔

پروفیسر گیان چند جین کی تصنیف ''اُردو کی نثری داستانیں'' اس حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ اُردو میں منظوم داستانیں بھی لکھی گئیں۔ بہمنی دور میں لکھی گئی مثنوی ''کدم راو پدم راو'' جنوبی ہند کی پہلی منظوم داستان ہے۔ مزید سیف الملوک و بدیع الجمال (غواصی)، گلشن عشق، علی نامہ (نصرتی) قطب مشتری (ملا وجہی) بھی مشہور منظوم داستانیں ہیں۔

دکن کی نثری داستانوں میں سبرس کے علاوہ طوطا کہانی ہے جس کا ماخذ سنسکرت ہے۔ فورٹ سینٹ جارج کالج کی سرپرستی میں جو داستانیں لکھی گئیں وہ دکن انجن (انوار سہیلی)، حکایت جلیلہ سنگھاسن بتیسی اور قصہ ملکہ زماں و کام کندلہ ہیں۔ ڈاکٹر فرزانہ بیگم کی تصنیف ''دکنی کی نثری داستانیں'' کا آخری باب ''نثر کی ترقی اور دکن میں داستان کا احیاء'' ہے۔ جس کے تحت انھوں نے دکن میں داستانوی دور کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ داستان کا ایک دور سب رس پر ختم ہو چکا لیکن فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر داستان گوئی کا ایک اور دور شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے تحت لکھی جانے والی داستانیں جب دکن پہنچی تو شمالی ہند کی زبان کو دکن والوں نے اپنی زبان میں پیش کیا۔ اس دور میں یہی کوشش کارفرما رہی۔ لیکن سب رس کی آب و تاب نے قارئین کے دل پر اپنی شہرت اور مقبولیت کا سکّہ جمالیا۔

جنوبی ہند کی طرح شمالی ہند میں بھی داستانوی دور کا آغاز منظوم داستانوں سے ہوتا ہے۔ شعلۂ عشق، دریائے عشق (میر تقی میر)، خواب و خیال (میر اثر) کے علاوہ سحر البیان (میر حسن) اور گلزار نسیم (پنڈت دیا شنکر نسیم) شمالی ہند کی منظوم داستانیں ہیں۔

شمالی ہند میں اُردو کی پہلی نثری داستان عطا حسین تحسین کی ''نو طرزِ مرصع'' ہے جو ۱۷۷۵ء تا ۱۷۸۱ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس میں چار درویشوں، بادشاہ آزاد بخت کے علاوہ ایک ضمنی قصہ بیان

کیا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کو اُردو داستان کا باقاعدہ آغاز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اگرچیکہ اس میں طبع زاد داستانیں نہیں لکھی گئیں بلکہ دوسری زبانوں سے اُردو میں ترجمہ کردہ داستانوں میں باغ و بہار (میر امن)، آرائش محفل اور طوطا کہانی (حیدر بخش حیدری)، داستان امیر حمزہ (خلیل خاں اشک)، بیتال پچیسی (مظہر علی خاں ولا) وغیرہ اہم ہیں۔ ان کا صرف لفظی ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ مصنفین نے اس میں اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے۔ اسی سبب اُردو نثر کو کافی فروغ ہوا۔ فورٹ ولیم کالج سے باہر جو داستانیں لکھی گئیں ان میں رانی کیتکی کی کہانی (انشاء اللہ خاں انشاء) اور فسانۂ عجائب رجب علی بیگ سرور مشہور ہیں۔ داستانیں زیادہ تر لکھنؤ میں لکھی گئیں۔ اس میں وہاں کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی ملتی ہے۔ ان داستانوں میں امراء کی آرام پسندی، عیش پرستی اور جاگیر دارانہ دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ عصر حاضر میں داستان گوئی کا کوئی رجحان نہیں ملتا۔

ناول

اُردو زبان کے دامن میں کئی زبانوں کے الفاظ اپنا رنگ و آہنگ سمیٹے ہوئے ہیں۔ لفظ ناول بھی اطالوی زبان کا لفظ ہے جو Novella تھا۔ انگریزی زبان نے جب اسے اپنایا تو یہ Novel ہوا۔ جسے اُردو نے بڑی فراخ دلی سے من و عن اپنالیا۔ اس کے لغوی معنی ''انوکھا'' یا ''نرالا'' کے ہیں۔ ناول کا شمار افسانوی ادب میں ہوتا ہے کہ وہ بھی ایک قصے یا کہانی پر مبنی ہوتی ہے لیکن اس کی کہانی داستان سے مختلف ہوتی ہے۔ داستان جب زوال پذیر ہوئی تو ادب کے اُفق پر ناول اُبھری شائد اسی لئے اسے ناول کا نام دیا گیا۔

ناول میں ایسے قصے یا کہانی کو پیش کیا جاتا ہے جس میں زندگی کے حقائق ملتے ہیں گو کہ قصہ فرضی ہوتا ہے مگر ایسا ہی قصہ بیان کیا جاتا ہے جو سماج یا معاشرے میں پیش آیا یا آسکتا ہو اور عقلی اعتبار سے اس کا وقوع پذیر ہونا ممکن ہو۔ یہی حقیقت نگاری اسے داستان سے الگ کرتی ہے۔ اس میں قصہ مسلسل ہوتا ہے لیکن اس کی طوالت داستان سے کم ہوتی ہے۔ یہ دوسری خصوصیت ہے جو اسے داستان سے جدا کرتی ہے۔ داستان کے برخلاف ناول میں تخیلاتی دُنیا یا آسمانی باتوں کا ذکر نہیں ملتا

بلکہ حقیقی دُنیا اور زمینی زندگی کا بیان ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کو کہانی کا موضوع بنایا جاتا ہے۔ ناول میں عمومی کردار انسان ہوتے ہیں۔ داستان کی طرح فوق الفطرت عناصر اور غیر ذی روح اشیاء کا تصور بھی اس میں بے جا ہے۔

ناول کے لکھنے کا مقصد تفریح طبع ہوتا ہے لیکن اسے کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ بھی بنایا جاتا ہے۔ کسی ملک میں سیاسی انقلاب لانا ہو یا کسی مخصوص نظام کے خلاف آواز اُٹھانی ہو یا معاشرے میں سدھار لانا ہو تو اس کے لئے ناول ایک کارآمد صنف قرار پاتی ہے۔ ناول کے عناصر ترکیبی درج ذیل ہیں : ۱) کہانی ۲) پلاٹ ۳) کردار ۴) مکالمے ۵) زماں و مکاں یا پس منظر ۶) نظریۂ حیات ۷) اسلوب۔ داستان یا دوسری اصناف کے برخلاف ناول مغربی ادب سے اُردو میں آئی۔ مندرجہ بالا عناصر میں سے کوئی بھی عنصر کمزور یا نامناسب ہو تو ناول کی مقبولیت یا شناخت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا انگریزی زبان کی مشہور ناول نگار خاتون ورجنیا وولف کے خیال میں شائد ہی کوئی ایسا علم وفن ہو جسے ناول میں پیش نہ کیا جا سکتا۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، نفسیاتی، تہذیبی اور فلسفیانہ ہر موضوع کو ناول میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ورجنیا وولف کے مطابق یہ شترمرغ کی طرح ہر چیز کو ہضم کر لیتی ہے۔

افسانوی ادب میں جن جن اصناف کا شمار ہوتا ہے ان میں کہانی اولین عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔

کہانی

ناول میں کہانی انسانی مسائل کے گرد گھومتی ہے اس لئے حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔ کسی بھی ناول میں کہانی کا آغاز واقعاتی انداز میں یا کسی منظر کی پیش کش سے ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والے کو متوجہ کر سکے۔ بعد ازاں واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ کہانی کو پیش کرنے کے دو طریقے رائج ہیں۔ ایک طریقہ یہ کہ ناول نگار قصہ گو کی حیثیت سے بیان کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ناول نگار کہانی کے کسی کردار کی زبانی قصہ کہلواتا ہے۔ یہ انداز، ڈرامائی اور دلچسپ ہے لیکن آسان نہیں۔

پلاٹ

کہانی کے واقعات کی ترتیب کو ''پلاٹ'' کہتے ہیں۔ کہانی کو پیش کرنے کا طریقہ اس قدر مربوط ہو کہ اگلا واقعہ پچھلے واقعہ کا نتیجہ معلوم ہو۔ کسی طرح اس میں قاری کو مصنوعی پن کا احساس نہ ہو۔ ایسے پلاٹ کو ''منظم پلاٹ'' کہتے ہیں۔ اگر پلاٹ میں مندرجہ بالا باتیں نہ ہوں تو اسے ''غیر منظم پلاٹ'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول کے تمام واقعات اگر ایک ہی قصے سے مربوط ہوں تو اسے ''سادہ پلاٹ'' اور اگر دو حصوں سے وابستہ ہوں تو اسے ''مرکب پلاٹ'' کہتے ہیں۔

کردار نگاری

ناول میں بچے، بوڑھے، عورت، مرد، عقل مند، بے وقوف، خوش مزاج بد مزاج، نیک و بد ہر طرح کے کردار ہوتے ہیں۔ ناول نگار نہ صرف انھیں ظاہری طور پر متعارف کرواتا بلکہ باطنی اعتبار سے بھی ان کا تعارف کرواتا ہے۔ ان کی تعلیم و ترتیب اور ماحول، وقت اور حالات کے مطابق ان کا بنتا یا بگڑنا بتاتا ہے۔ اسے کردار نگاری کہتے ہیں۔

مکالمہ نگاری

مکالمہ نگاری کرداروں کی باہمی گفتگو کو کہتے ہیں۔ اس میں تخلیق کار کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مکالمے کرداروں کی مناسبت سے ہوں۔ ناول یا افسانہ میں جتنے کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے مکالمے میں ان کی شخصیت، مزاج اور قصے کی مناسبت سے ہوں۔ کوئی بھی انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار مکالموں سے کرتا ہے۔ اس طرح ناول نگار بھی وقت اور موقع کی مناسبت سے کرداروں کے جذبات واحساسات کو مکالموں کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔

منظر نگاری

ناول کی منظر نگاری میں بھی ناول نگار کو اپنا کمال دکھانا پڑتا ہے کہ کوئی بھی منظر اس میں اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ قاری کی نظروں کے سامنے آجائے، چاہے وہ کہیں کی سجاوٹ، آرائش یا کہیں کی تباہ حالی ہو۔

اسلوب یا زبان و بیان

ناول میں کئی واقعات تسلسل کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں اور کئی کرداروں کو پیش کیا جاتا ہے۔ واقعات کی نوعیت پر زبان و بیان کا انحصار ہو تب ہی قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ واقعات اگر تلخ ہوں تو زبان و اندازِ بیان بھی اسی کی مناسبت سے ہو۔ چنانچہ ناول میں کبھی طنزیہ، کبھی شگفتہ، کبھی مزاحیہ اور کبھی بیانیہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔

اُردو ناول نگاری کا آغاز و ارتقاء

ہندوستان ۱۸۵۷ء میں غدر کے ہنگاموں سے دوچار ہوا، ناول اسی انقلابی تبدیلیوں کی دین ہے۔ بہادر شاہ کی حکومت اور جاگیرداری نظام کا اختتام ہوا تو متوسط طبقے نے اہمیت حاصل کر لی۔ تعلیم کا رجحان عام ہوا، چھاپے خانے کی سہولت نے اس رجحان کو بڑھاوا دیا، خواتین میں بھی یہ رجحان پیدا ہوا۔ انھیں کی ضرورت کی تکمیل کے لئے ناول لکھے گئے (انگریزوں میں بھی رچرڈسن نے پہلا ناول pamela لکھا)

ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء

ضلع بجنور سے تعلق رکھتے تھے۔ حصولِ تعلیم کے لئے دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ اُردو میں ڈپٹی نذیر احمد کو پہلے ناول نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں اپنی لڑکیوں کے لئے لکھی تھی۔ اس دلچسپ ناول پر سرکار سے انھیں انعام بھی ملا۔ اس وقت چوں کہ مغربی تہذیب نوجوان طبقے کو گمراہ کر رہی تھی۔ نذیر احمد کی ناولوں کا مقصد نوجوان طبقے کو اندھی تقلید سے روکنا تھا۔ مذہبی بیداری اور اصلاحِ معاشرہ کے تحت انھوں نے کئی ناول جیسے ''بنات النعش''، ''توبۃ النصوح، فسانہ مبتلا، ایامیٰ، رویائے صادقہ اور ابن الوقت لکھے۔ ابن الوقت کو ان کا بہترین ناول قرار دیا جاتا ہے۔ بعض نقاد ڈپٹی نذیر احمد کو پہلا ناول نگار قرار دینے میں جھجکتے ہیں لیکن انھیں یہ سوچنا چاہئے کہ جس کے آگے ناول کا کوئی نمونہ ہی موجود نہ ہو، اس کے باوجود اس نے ایک نئی صنف پر قلم اُٹھایا ہو تو یہ باعثِ تنقید نہیں بلکہ باعثِ تحسین ہے۔ مولوی نذیر احمد کے ناول، ناول نگاری کے ابتدائی نقوش ہیں۔ اس طرح ڈپٹی نذیر احمد یقیناً پہلے ناول نگار ہیں۔

نذیر احمد کی شخصیت مذہبی، علمی اور ادبی اعتبار سے بہت بلند ہے۔ ان کی علمی خدمات پر حکومت نے انھیں کئی انعامات سے نوازا ہے۔ ۱۸۹۸ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ پیشہ تدریس سے وابستگی نے انھیں اعلیٰ مدارج پر فائز کیا۔ ان کا تفصیلی ذکر سرسید کے رفقاء کے تحت کیا گیا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۲ء

سرشار کا وطن کشمیر تھا لیکن انھوں نے لکھنؤ میں ہی قیام کیا۔ رتن ناتھ سرشار کا نام ڈپٹی نذیر احمد کے بعد ملتا ہے۔ سیر کہسار، جام سرشار اور فسانہ آزاد میں فسانہ آزاد نے زیادہ شہرت پائی۔ یہ فنی اعتبار سے داستان اور ناول کی درمیانی کڑی سمجھی جاتی ہے۔ سرشار نے اس کے علاوہ کئی کتابیں لکھیں جن میں پی کہاں، کامنی، طوفان بدتمیزی، کرم دھم، بچھڑی ہوئی دلہن اور خدائی فوجدار وغیرہ۔ لیکن فسانہ آزاد کے مقابلے میں انھیں اتنی شہرت نہ ملی۔ فسانہ آزاد میں سرشار نے اس وقت کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے روزمرہ کے واقعات کو پیش کیا ہے۔ بیان میں شگفتگی کے ساتھ سلاست بھی ملتی ہے۔ اپنی ناولوں میں انھوں نے لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور اس وقت کی سوسائٹی کا ہو بہو نقشہ کھینچا ہے۔ سرشار شاعر ادیب اور صحافی بھی تھے۔ قیام حیدرآباد کے دوران وہ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے استاد اور دبدبہ آصفیہ کے ایڈیٹر بھی رہے۔

عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء تا ۱۹۲۶ء

شرر لکھنؤ کے متوطن تھے۔ عبدالحلیم شرر نے معاشرتی اور تاریخی ہر دو قسم کے ناول لکھے لیکن ان کی تاریخی ناولیں وہ مقام حاصل نہ کر سکیں، تاہم ''فردوس بریں'' نے زیادہ شہرت پائی۔ سرشار کے برخلاف شرر نے اپنی ناولوں میں سنجیدگی کو اپنایا۔ ان کی دوسری ناولوں میں ''فلورا اور فلورانڈا'' اور حسن کا ڈاکو بہت دلچسپ ہیں۔ شرر نے تاریخ میں بھی اسلامی تاریخ کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے مضمون نگار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی اور ''دلگداز'' نامی رسالہ بھی جاری کیا۔ کچھ عرصہ شرر نے حیدرآباد میں قیام کیا، انھوں نے تاریخ سندھ بھی لکھی۔ وہ انگلستان بھی گئے اور وہاں تین سال تک قیام رہا۔

مرزا محمد ہادی رسوا ۱۸۵۸ء تا ۱۹۳۱ء

رسوا لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کا نام اُردو ناول نگاروں میں امتیازی مقام رکھتا ہے۔ ان کے ناول ''امراء و جان ادا'' نے ناول نگاری کے فن کو اک نیا موڑ عطا کیا۔ رسوا کے ناول بھی تاریخ کا احاطہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اکثر ناول لکھنؤ کے پس منظر میں لکھے ہیں۔ سماج کے اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں کرداروں کو اپنی ناولوں میں پیش کیا ہے۔ فن ناول نویسی کا پورا خیال رکھا ہے۔ انسانی فطرت کا مطالعہ اور خاص اندازِ بیان ہی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔

رسوا ابتداء ہی سے علم کا شغف رکھتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کئی زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ ریاضی اور نجوم کا شوق ورثہ میں ملا تھا۔ کیمسٹری شوقیہ پڑھی۔ تاحیات مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ رسوا شاعر بھی تھے اور ادیب بھی لیکن ان کے مطبوعات میں سائنس بھی ملتی ہے۔

راشد الخیری ۱۸۶۸ء تا ۱۹۳۶ء

دہلی سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے عزیزوں میں تھے۔ ان کے والد عبدالواحد کا انتقال ان کی کمسنی میں ہی ہوگیا۔ ابتداء میں پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہ تھی لیکن جب ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد ہوئے تو انھیں مطالعہ سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ رسالہ ''مخزن'' میں اپنے مضامین بھیجنے لگے بعد ازاں خود بھی پرچے نکالنے لگے۔

راشد الخیری ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور ناول نویس بھی تھے۔ ان کی تحریروں میں حزن و ملال اور حسرت و یاس کی کیفیت کے سبب انھیں مصورِ غم بھی کہا جاتا ہے۔ اپنے استاد کی طرح اصلاحِ معاشرہ اور خواتین کی اصلاح کا بھی بیڑہ اُٹھایا۔ مشرقی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے مغربی تہذیب کی تقلید سے روکتے تھے۔ ان کی ناولوں میں صبح زندگی، شام زندگی، آمنہ کا لال، سیدہ کا لال اور سرابِ مغرب نے زیادہ شہرت پائی۔

پریم چند ۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء

دھنپت رائے نام پہلے نواب رائے اور بعد میں پریم چند کے قلمی نام سے لکھنے لگے۔ ضلع

بنارس سے تعلق رکھتے تھے۔ عسرت اور تنگدستی کے سبب بی-اے تک بڑی مشکل سے تعلیم حاصل کی۔ تقریباً پچیس سال تک پیشہ تدریس سے وابستہ رہے۔ مطالعہ کے شوق نے انھیں لکھنے پر آمادہ کیا۔ ۱۹۱۸ء میں تحریک عدم اشتراک کے سبب ملازمت سرکار سے استعفیٰ دے دیا اور قلم کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ کچھ عرصہ صحافت سے وابستہ ہوئے لیکن افسانہ نگاری کا جلد ہی آغاز کیا۔ بعد ازاں ناول کے میدان کا انتخاب کیا اور افسانہ نگار و ناول نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔ ابتدائی افسانوں اور ناولوں میں ترقی پسندی کا عنصر نہیں ملتا لیکن بعد کی تحریر میں یہی عنصر غالب ہے۔ چنانچہ ان کے افسانے اور ناول اُردو ادب کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

رسوا کے بعد ناول نگاری کے فن میں پریم چند جیسی قد آور شخصیت کا نام ملتا ہے۔ ان کی ناول نگاری زیادہ تر دیہات کے موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔ غریب اور محنت کش عوام کے مسائل کو انھوں نے اپنے ناول کا موضوع بنایا۔ کسانوں کے مسائل، ہندو سماج کے مسائل، ذات پات کا بھید بھاؤ اور ستی کی رسم سب کو انھوں نے اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ جلوۂ ایثار، بیوہ، نرملا، بازارِ حسن، گوشۂ عافیت، میدان عمل اور گئودان ان کے مشہور ناول ہیں۔ ان میں فنی اعتبار سے گئودان زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ پریم چند کا شمار ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک کے علم برداروں میں ہوتا ہے۔

پریم چند کے ہم عصر ناول نگاروں میں نیاز فتح پوری کے ناول ''شہاب کی سرگذشت'' اور ''شاعر کا انجام'' رومانی رجحان کے حامل ہیں۔

ترقی پسند ناولوں میں شکست (کرشن چندر)، ٹیڑھی لکیر (عصمت چغتائی)، ''گریز'' (عزیز احمد) کے علاوہ لندن کی ایک رات (سجاد ظہیر) کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' ترقی پسند ناولوں میں امتیازی مقام رکھتا ہے۔ شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی نے مزاحیہ ناولوں کے ذریعہ اپنی پہچان بنائی۔ عبداللہ حسین، ہاجرہ مسرور، علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری عصر حاضر کے ناول نگار مانے جاتے ہیں۔

ناولٹ

یہ ناول کی مختصر ترین شکل ہے جو افسانے سے طویل اور ناول سے مختصر ہوتی ہے۔ گیان چند

جین اپنی تصنیف ''ادبی اصناف'' میں سجاد ظہیر کی لکھی ''لندن کی ایک رات'' کا شمار ناولٹ میں کرتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں رسالہ ''شاعر'' کا ایک ضخیم ناولٹ نمبر بھی نکل چکا ہے۔ تکنیک میں ناولٹ ناول کی طرح ہوتی ہے۔

مختصر افسانہ

افسانہ افسانوی ادب کی ہی ایک صنف ہے، جس میں کہانی یا قصہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صنف بھی انگریزی سے اُردو میں آئی۔ انگریزی میں اسے short story کہا جاتا ہے۔ ناول کی طرح افسانہ بھی ملک کے بدلتے ہوئے حالات، تقاضوں اور چھاپہ خانے کی سہولت کے سبب وجود میں آیا۔ جب زندگی کی مصروفیات کے سبب ناول کی مقبولیت کم ہونے لگی تو افسانہ میدان ادب میں نمودار ہوا۔ پہلے طویل افسانے لکھے جاتے تھے بعدازاں اس میں بھی اختصار کا رجحان ہوا۔

مختصر افسانے کے تعارف میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ایسی مختصر، مکمل اور دلچسپ کہانی جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے، مختصر افسانہ کہلاتی ہے۔ ایک ہی نشست کی وضاحت آدھے سے ایک گھنٹے میں کی جاتی ہے۔ چھاپے خانوں کی سہولت کے بعد رسائل اور اخبارات کی اجرائی مختصر افسانے کے فروغ کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئی۔ عصر حاضر کے اخبارات اور رسائل بھی مختصر افسانے کے فروغ میں مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختصر افسانہ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء کے بعد منظر عام پر آیا۔

مختصر افسانے کی بنیادی خصوصیات

مختصر افسانے کی خصوصیات بھی وہی ہیں جو تقریباً ناول کی ہیں، صرف طریقۂ کار کا فرق ملتا ہے۔

۱) مختصر افسانے میں آغاز سے اختتام تک ایک گہرا ربط ہوتا ہے۔ افسانہ ابتداء میں ہی اپنے مرکزی خیال کو پیش کر دیتا ہے۔

۲) یہ زندگی کے کسی ایک واقعہ، ایک کردار یا زندگی کی ایک جھلک کو پیش کرتا ہے، لہٰذا غیر متعلق یا غیر ضروری باتوں کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔

۳) کہانی مختصر لیکن مکمل اور جامع ہوتی ہے، اس میں کسی طرح کی تشنگی نہیں رہتی۔

۴) ناول کی طرح مختصر افسانے میں بھی پلاٹ کا ہونا ضروری ہے، جس میں واقعات کی ترتیب سے ہی ایک واقعہ دوسرے واقعہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ کردار، مکالمے، زماں و مکاں یا منظر نگاری، نظریہ حیات اور اسلوب بھی مختصر افسانے کی خصوصیات قرار پاتی ہیں۔

مختصر افسانے کا آغاز وارتقاء

یوں تو افسانے کا آغاز انیسویں صدی میں ہی ہو چکا تھا لیکن مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا۔ اس دور کے رسائل جیسے ''مخزن'' اور ''ادیب'' میں یہ مختصر افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔

پریم چند ۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء

ترقی پسند تحریک سے پہلے افسانہ نگاری کے سلسلے کا آغاز پریم چند نے کیا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں حب الوطنی کے جذبات اور ہندوستانیوں کے اپنے وطن سے متعلق جذبات واحساسات اور ان کی تڑپ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس دور کے افسانوں میں ''بڑے گھر کی بیٹی'' اور ''انتقام'' کے نام شامل ہیں۔ پہلی بار پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہات کے مسائل کو پیش کیا اور ہندوستان میں ہندو فرقے کے ذات پات کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ کفن، عیدگاہ اور نمک کا داروغہ ان کے مشہور افسانے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم ۱۸۸۰ء تا ۱۹۴۳ء

ضلع بجنور سے تعلق رکھتے تھے۔ علی گڑھ کالج سے بی۔اے کیا۔ ترکی زبان سے دلچسپی کے سبب اس میں مہارت حاصل کرلی۔ یلدرم نے ملازمت کے سلسلے میں کئی مقامات کا سفر کیا۔ بحیثیت ترجمان عراق بھی گئے۔ مزید مہاراجہ محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری رہے اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے رجسٹرار ہونے کا بھی شرف رکھتے ہیں۔ اپنی عمر کا آخری حصہ لکھنؤ میں گزارا۔

دوسری زبانوں سے ادب کو اُردو زبان میں منتقل کرنے والوں میں یلدرم کا نام اہمیت کا

حاصل ہے۔ انھوں نے انگریزی اور زیادہ تر ترکی زبان کے افسانوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان میں اکثر افسانے طبع زاد تصنیف کا درجہ رکھتے ہیں۔ یلدرم رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے انگریزی ترکی زبانوں کے ترجموں پر مشتمل افسانوں کا مجموعہ ''خیالستان'' کے نام سے شائع ہوا، جس میں یلدرم نے اپنی کامیاب ترجمہ نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

یلدرم کے طبع زاد افسانے بھی ملتے ہیں، جس میں انھوں نے انسان کے جذبات و احساسات کے ساتھ ان کی نفسیات کو بھی پیش کیا ہے۔

سلطان حیدر جوش وفات ۱۹۵۳ء

یہ بدایون سے تعلق رکھتے تھے لیکن بچپن دہلی میں گزرا اور تعلیم بھی دہلی میں پائی۔ علی گڑھ میں بھی کچھ عرصہ تعلیم پائی۔ دہلی میں ملازمت کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

جوش بھی افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت اس طرح رکھتے ہیں کہ وہ ہندوستانیوں کو مغرب کی تقلید سے بچا کر معاشرے کو بہترین بنانا چاہتے ہیں۔ اپنے اس مقصد کے لئے وہ ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں۔ کبھی سنجیدگی اور کبھی طنز و مزاح سے معاشرے کی خامیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کوشش میں اکثر ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ زبان و بیان میں کافی دلکشی اور پختگی ہے۔ ان کے افسانوں کی تمہید کافی طویل ہوتی۔ فن افسانہ نگاری کے اعتبار سے ان کے افسانوں کو اتنی شہرت نہ مل سکی۔ ''افسانہ جوش'' اور ''فکر جوش'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ افسانے کے ان اولین نقوش کے بعد افسانہ نگاروں میں مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری کے نام ملتے ہیں۔ اس دور کے افسانے حقیقت نگاری سے بعید ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کا اُردو ادب پر یہ اثر ہوا کہ فرانسیسی، انگریزی اور روسی زبان کے افسانوں کے ترجمے اُردو میں ہونے لگے، اس کا اثر ہندوستانی افسانہ نگاروں پر اس طرح پڑا کہ انھوں نے بہ اعتبار فن اپنے افسانوں کا جائزہ لیا۔ حقیقت نگاری دوبارہ افسانے کا حصہ بن گئی۔ ترقی پسند تحریک کے سبب جہاں دوسری اصناف نے ترقی پسندی کو اپنایا وہیں افسانہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ افسانے میں تخیل کے بجائے حقیقت نگاری، سماج کے مسائل، سیاسی اور معاشی موضوعات بھی افسانے کا حصہ بنے۔ کرشن چندر، اختر انصاری، حیات اللہ انصاری، پروفیسر محمد

مجیب، اختر حسین رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو کے علاوہ اور کئی نام اس دور کے افسانہ نگاروں کی حیثیت سے ملتے ہیں۔

علی عباس حسینی پیدائش ۱۸۹۷ء

غازی پور سے تعلق رکھتے تھے، پٹنہ اور الہ آباد سے تعلیم حاصل کی جس کی تکمیل کے بعد پیشہ تدریس کو اپنایا۔ ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بعد ازاں افسانہ نگاری کو ہی اپنا مشغلہ بنالیا، یہی ان کا مخصوص انداز ہے۔ کبھی افسانے کو بہت زیادہ طول دیتے ہیں اور کبھی مختصر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار زیادہ تر دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جہاں اصلاحی پہلو ملتا ہے، وہیں ظرافت کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ ''آئی سی یس''، ''ہمارا گاؤں'' اور ''باسی پھول'' ان کے افسانوں کے مشہور مجموعے ہیں۔ ان کے ابتدائی اور اکثر افسانوں میں مقامی رنگ یعنی دیہات کی فضائیں اور وہاں کا ماحول ملتا ہے۔ دیہات کی زندگی میں وہ سکون تلاش کرتے ہیں۔ پریم چند کی طرح دیہات کی منظر نگاری اور وہاں کی زندگی پر وہ مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں لیکن شہری زندگی سے فرار نہیں چاہتے۔ اس میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ و رواں ہوتی ہے۔ تشبیہات واستعارات کا مناسب استعمال ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار عموماً سماج کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کرشن چندر ۱۹۱۳ء تا ۱۹۷۷ء

کرشن چندر نہ صرف افسانہ نگار بلکہ ناول نگار کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں شہری اور دیہی دونوں زندگیوں کے نقش ملتے ہیں۔ پریم چند کے بعد افسانہ نگاری کو ترقی دینے میں کرشن چندر کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی ابتدائی زندگی کشمیر میں بسر ہوئی، بعد ازاں لاہور سے ایم۔اے اور وکالت کی سند حاصل کی۔ پیشہ تدریس سے کچھ عرصہ وابستہ رہنے کے بعد اسے خیر باد کہہ کر دہلی آئے، کچھ عرصہ ریڈیو سے وابستہ رہے، اس کے بعد بمبئی آئے اور فلم کی کہانیاں لکھنے لگے۔ آخرکار افسانہ نگاری میں مشغول ہوگئے۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کی منظر نگاری کے دلکش نمونے بھی ملتے ہیں۔ کرشن چندر اپنے افسانوں میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ رومانیت کی

خامیوں اور کوتاہیوں پر بھی بھرپور تنقید کرتے ہیں۔ غلامی، افلاس، بھوک اور طبقاتی جنگ کو انھوں نے بڑی بے باکی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

''زندگی کے موڑ پر''، ''ٹوٹے ہوئے تارے'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کا امتزاج نظر آتا ہے۔

فنی اعتبار سے کرشن چندر اُردو کے کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کی زبان و بیان دلکش ہوتی ہے اور وہ زندگی کے نشیب و فراز پر روشنی ڈالتے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق کو منظر عام پر لانا ان کا مقصد ہوتا ہے۔ ان کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ کرشن چندر بھی متوسط طبقے کی زندگی کے مسائل کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس وقت کی حکومت سے نفرت کا احساس ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کرشن چندر کی افسانہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں :

> ''ان کے ذہنی ارتقاء کا دوسرا دور وہ ہے جب اشتراکیت سے وہ قریب ہو گئے تھے۔ اس وقت کے افسانے کے مجموعے میں ''نظارے'' خاص طور پر قابل قدر ہے۔ تیسرا دور تقسیم ہند کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جس میں ان کا بہترین شہکار ''ہم وحشی ہیں'' ہے، اس کے بعد کئی ایک مجموعے افسانوں کے وہ ادب کو دے چکے ہیں جو نہایت قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں''۔ [1]

سعادت حسن منٹو ۱۹۱۳ء تا ۱۹۵۵ء

ضلع لدھیانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ امرتسر اور علی گڑھ میں اسکول کی تعلیم پانے کے بعد بمبئی میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ رسالے ''مصور'' کے مدیر رہے۔ منٹو نے خاکے، افسانے اور ڈرامے بھی لکھے لیکن افسانے نے انھیں شہرت عطا کی۔ انھوں نے جنسیات کو ہی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ طوائفوں کو اپنے افسانوں کا مرکزی کردار بنا کر سماج کو ان کی مجبوری اور بے بسی سے واقف کرنا چاہتے ہیں، جس کو سماج پچھڑا ہوا اور رسوائے زمانہ طبقہ سمجھ کر ان سے نفرت کرتا ہے لیکن منٹو کا طرزِ تحریر بعض اوقات اصلاح کے بجائے لطف اندوزی پر مائل کرتا ہے۔ انھوں نے طوائفوں کی زندگی کے

---

[1] مختصر تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص ۲۶۶

المناک مصائب کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ منٹو کے منتخبہ افسانوں کو ڈاکٹر اطہر پرویز نے ''منٹو کے نمائندہ افسانے'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام منٹو نے لاہور میں گذارے۔

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی ایک ناول نگار سے زیادہ افسانہ نویس کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ آگرہ ان کا وطن تھا لیکن جے پور، آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیم پانے کے بعد پیشہ درس وتدریس سے وابستہ ہوئیں، اسی سلسلے میں بمبئی بھی آئیں۔ بعد ازاں ملازمت ترک کر کے ادبی دُنیا سے وابستہ ہوگئیں۔ سماج کے متوسط طبقے کے مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ازدواجی زندگی کے مسائل سے دوچار عورت کی مظلومیت سے بھی سماج کو آگاہ کیا ہے۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام پر کڑی تنقید کی ہے۔ سماج کی خامیوں کو بیان کرنے کے دوران ان کا لہجہ تلخ اور ناگوار نہیں ہوتا۔ جنسی مسائل کو بھی وہ اپنے افسانوں میں جگہ دیتی ہیں۔ زبان وبیان دلچسپ ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر

سجاد حیدر یلدرم کی دختر قرۃ العین حیدر بھی رومانوی افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ آزادی کے بعد تقسیم ہند اور فسادات کے المیے کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ سماج کے اعلیٰ طبقے کے لوگ ان کے افسانوں کے کردار ہوتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام کے خدوخال اور اس کی تہذیب کے عکس کو اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ سماج میں عورتوں پر ظلم وجبر اور ان کی ناقدری کے سبب عورتوں کی مظلومیت اور ان کے صبر، ان کی بے بسی اور لاچاری کی تصویر اپنے افسانوں میں کھینچتی ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی ۱۹۱۵ء تا ۱۹۸۴ء

اُردو افسانہ نگاری کے سلسلے میں بیدی کا نام کافی شہرت رکھتا ہے۔ ان کے افسانے حقیقت پسندی پر مبنی ہوتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی بڑی سچائیوں کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انسانی نفسیات کو بھی بیدی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ عورت کی نفسیات پر انھوں نے

زیادہ توجہ دی ہے۔ عورت کو ماں، بہن، بیوی، بیٹی اور ساس بہو ہر کردار میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار سماج کے متوسط طبقے کے کردار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر پنجاب ہے۔ موضوع اور افسانے کی تکنک کے اعتبار سے بہترین افسانے انھوں نے پیش کئے ہیں۔

ان کے علاوہ اُردو افسانے کے سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کا نام بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نہ صرف ایک بہترین افسانہ نگار تھے بلکہ وہ ایک شاعر، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے بھی شناخت رکھتے تھے۔ خواجہ احمد عباس، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد وغیرہ نے بھی بحیثیت افسانہ نگار شہرت پائی ہے۔ واجدہ تبسم، جیلانی بانو اور رفیعہ منظور الامین نے جنوبی ہند دکن کی تہذیب کو اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد افسانہ نگاروں کی فہرست میں کئی اور نام ملتے ہیں، جن میں خواتین و مرد دونوں شامل ہیں۔

ڈرامہ

ڈرامہ یونانی لفظ ''ڈراؤ'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ''عمل'' کے ہیں۔ یونانی لفظ ڈراؤ سے انگریزی میں ڈرامہ کہلایا اور انگریزی لفظ ڈرامہ کو اُردو والوں نے لفظ ناول کی طرح من و عن اپنالیا۔

اُردو لغت میں ڈرامہ کے معنی ''ناٹک'' یا ''تمثیل'' کے ہیں۔ یعنی کسی بھی واقعے یا قصے کو عملاً پیش کرنا ڈرامہ کہلاتا ہے۔ ڈرامہ افسانوی ادب کی قدیم ترین صنف ہے۔ افسانوی ادب داستان، ناول اور افسانے کی طرح ڈرامہ بھی کسی قصے یا داستان پر مشتمل ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ داستان، ناول اور افسانے میں قصہ صرف تحریری ہوتا ہے لیکن ڈرامے میں قصے کو عملی طور پر پیش کیا جاتا ہے، جس کے لئے اسٹیج کا وجود یقینی ہے۔ عموماً ان دونوں میں کہانی یا قصہ پیش کیا جاتا ہے اس لئے ان میں کرداروں کا ہونا ضروری ہے۔ ناول کے کردار غیر متحرک یا ناول نگار کی زبانی متحرک ہوتے ہیں۔ جب کہ ڈرامے کے کردار عملی طور پر متحرک ہوتے ہیں۔ ڈرامہ یونانی لفظ سے مشتق ہے۔ یہاں ڈرامے سے متعلق ارسطو کے خیال کو پیش کرنا بے جا نہ ہوگا۔ ارسطو کے خیال کے مطابق ڈرامہ انسانی افعال کی نقل ہے۔ سسرو کے مطابق ڈرامے میں زندگی کی نقل، رسم و رواج اور سچائی کے عکس کو پیش کیا

جاتا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس کے خیال کے مطابق زندگی کے حقائق کو ڈرامے میں اشخاص اور مکالموں کے ذریعہ عملی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔اس کا مطلب یہی ہے کہ ڈرامہ میں اسٹیج کے ساتھ ساتھ مکالمے بھی ناگزیر ہوتے ہیں۔

ڈرامے المیہ بھی ہوتے ہیں اور طربیہ بھی۔معنوی اعتبار سے المیہ پر مبنی ڈرامے سے سامعین درد والم کا تاثر قبول کرتے ہیں اور طربیہ پر مبنی ڈرامہ سے خوشی کا تاثر ملتا ہے۔

ڈرامے کے اجزائے ترکیبی

قصہ، کردار اور پلاٹ کو ڈرامے کے اجزائے ترکیبی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔قصہ کسی بھی ڈرامے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔جسے کرداروں کے عمل اور مکالموں کے ذریعہ ایک مخصوص ترتیب یا پلاٹ کے تحت اسٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔قصے کو کرداروں کے عمل کے ذریعہ آگے بڑھانے کی ترتیب کو ہی پلاٹ کہا جاتا ہے۔

اُردو میں ڈرامے کا آغاز وارتقاء

ہندوستان میں پہلے سنسکرت زبان میں ڈرامے کا آغاز ہوا۔بعد ازاں ۱۹ویں صدی یعنی ۱۸۴۶ء کو واجد علی شاہ اختر نے اُردو میں ''رادھا کنھیا کا قصہ'' لکھا، اسے قیصر باغ میں ''رہس'' کے نام سے دکھایا جاتا تھا۔

امانت

واجد علی شاہ کے بعد آغا حسن امانت نے ۱۸۵۲ء میں ''اندر سبھا'' لکھا، اسے اول الذکر ڈرامے سے زیادہ مقبولیت ملی۔اس کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ اسے پہلی بار عوام کے سامنے اسٹیج پر پیش کیا گیا جو عوامی تفریح کا باعث ہوا۔امانت نے ایک منظوم داستان کو ڈرامے کے انداز میں پیش کیا اور مثنویوں کے اشعار بھی مکالمے کے طور پر استعمال کئے۔اس میں انسان اور پریوں کے عشق کو پیش کیا گیا ہے۔اس ڈرامے میں سادہ اور عام زبان کا استعمال ہوا ہے۔یہ ڈرامہ عوام میں اتنا مقبول ہوا کہ لکھنؤ کے دیہات کے علاوہ مختلف مقامات بمبئی، گجرات اور بنگال بھی پہنچا۔اس دور میں صنف

ڈرامہ ''اندر سبھا'' کے نام سے موسوم ہوگیا۔

اس کے بعد بمبئی اور کلکتہ میں تھیٹریکل کمپنیاں قائم ہوئیں، جس سے ڈرامے کو کافی فروغ ہوا۔اس دور میں ڈرامے پیش کرنے کا مقصد صرف تفریح طبع تھا۔ان ڈراموں میں مزاحیہ کرداروں کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔منظوم ڈرامے لکھے جاتے یا نظم نما نثر کا استعمال ہوتا۔سامعین کی تفریح طبع کے لئے اس میں غزل یا گیت بھی پیش کئے جاتے۔

مہدی حسن احسن لکھنوی اور بیتاب بریلوی اور طالب بناری نے بھی ڈرامے لکھے لیکن ان کے ڈراموں کا مقصد بھی تفریح طبع تھا۔

آغا حشر کاشمیری ۱۸۸۹ء تا ۱۹۳۵ء

آغا حشر کاشمیری کا نام ڈرامہ نگاری کے لئے کافی مقبولیت کا حامل ہے، جس نے پہلی مرتبہ سنجیدہ ڈرامے لکھے۔آغا حشر نے دوسری زبانوں سے ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا اور نئے ڈرامے بھی لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔انھوں نے ڈراموں میں گیتوں یا گانوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ان کے ڈراموں میں ''اسیر حرص''، ''سفید خون''، ''میٹھی چھری'' اور ''شام جوانی'' زیادہ مقبول ہوئے۔ان کے علاوہ حسینی میاں ظریف، رونق بناری، مرزا نظیر بیگ کے نام بھی ڈرامہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔مرزا ہادی رسوا اور ظفر علی خاں کے نام بھی اُردو ڈرامہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔احمد شجاع کے ڈرامے ''باپ کا گناہ''، ''آخری فرعون''، ''حسن کی قیمت'' اور ''جانباز'' نے ڈرامہ نگاری کے میدان میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ان کے علاوہ عابد حسین، اشتیاق حسین نے بھی ڈرامہ لکھے۔

امتیاز علی تاج ۱۹۰۰ء تا ۱۹۷۰ء

۲۰ویں صدی کے آغاز میں امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' نے اُردو ادب میں لازوال شہرت پائی۔اگر چہ کہ امتیاز علی تاج نے دوسرے ڈرامے بھی لکھے لیکن ڈرامہ انارکلی جیسی شہرت کسی اور ڈرامے کے حصے میں نہیں آئی۔ڈرامہ ''انارکلی'' اسٹیج پر پیش نہیں کیا جاسکتا لیکن ایک مکمل المیہ ڈرامہ ہے، اس میں ڈرامہ نگار نے ''انارکلی'' کو اکبر اعظم کے حکم پر زندہ دیوار میں چنوادینے کے انسانیت

سوز واقعہ کو پیش کیا ہے لیکن یہ واقعہ تاریخی اعتبار سے حقائق پر مبنی نہیں ہے۔

پروفیسر محمد مجیب

پروفیسر محمد مجیب نے ڈرامہ ''خانہ جنگی'' لکھا جس میں انھوں نے اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی تخت کے لئے آپسی جنگ کو پیش کیا، جو کافی مشہور ہوا۔ پروفیسر محمد مجیب کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اس ڈرامے نے اُردو ڈرامہ نگاری کے فن کو وسعت دی

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ایک اور شخصیت عبدالغفار مدھولوی نے بھی صنفِ ڈرامہ کے تحت کئی ڈرامے پیش کئے۔

نشرواشاعت کی سہولت نے ڈرامہ نگاری کو فروغ بخشا۔ ابتداء میں تو ریڈیو پر بھی ڈرامے پیش کئے جاتے لیکن عصر حاضر میں ٹیلی ویژن نے ڈرامہ کے فن کو فروغ دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن یہ ڈرامے کافی طویل ہوتے ہیں جس کی پیش کش کا سلسلہ کئی مہینوں بلکہ سالوں تک چلتا ہے۔ اس میں زندگی کے حقائق اور عصر حاضر کے مسائل کو بھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ناول اور افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور انتظار حسین کے نام ڈرامہ نگاروں کی حیثیت سے بھی لئے جاتے ہیں۔

خاکہ

خاکہ کے لغوی معنی ڈھانچہ یا کچا نقشہ یا صرف لکیروں کی مدد سے بنائے ہوئے نقشے کے ہیں۔ انگریزی میں اسے sketch کہا جاتا ہے۔ اُردو میں خاکے کے لئے مرقعہ یا قلمی تصویر جیسے الفاظ اصطلاحاً استعمال کئے جاتے ہیں۔

خاکہ نگاری کو سوانح نگاری کی ذیلی قسم کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اس میں بھی کسی شخصیت کی قلمی تصویر پیش کی جاتی ہے لیکن سوانح کافی طویل اور تفصیلی ہوتی ہے اور خاکہ اس کے مقابلے میں کافی مختصر ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری ایک ایسا فن ہے کہ جس میں خاکہ نگار مختصر انداز میں کسی شخصیت کی ایسی قلمی تصویر پیش کرتا ہے کہ قاری کے سامنے اس کی جیتی جاگتی تصویر آجاتی ہے۔ خاکہ نگار اپنے الفاظ کے ذریعہ ایسی تصویر بناتا ہے کہ جس سے اس شخصیت کے نہ صرف خدوخال اُبھرتے ہیں بلکہ

اس کی سیرت، عادات واطوار اور کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عموماً خاکہ نگار اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بناء پر کسی شخصیت کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں حقائق کا بیان زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اپنے ذاتی تعلق یا اختلاف کا اظہار خاکہ نگار غیر محسوس طریقے سے کرتا ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر خلیق انجم خاکہ نگاری سے متعلق تحریر کرتے ہوئے خاکہ نگاری کو سوانح نگاری کی ایک قسم قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین بجز تفصیل اور اختصار کے مزید کوئی فرق نہیں بتاتے۔ لکھتے ہیں :

> ''سوانح میں کسی انسان کی سیرت کو اس کے عہد بہ عہد حالاتِ زندگی، خارجی اثرات اور کارناموں کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے جب کہ خاکہ میں اختصار اور اشاروں میں اس کی سیرت کے کچھ ایسے نقوش اُبھارے جاتے ہیں جو اس کے کردار کا ایک زندہ اور حقیقی تصور دے سکیں''۔ [1]

جس طرح اصنافِ شاعری میں مہارت رکھنے والا شاعر رباعی لکھ سکتا ہے، اسی طرح کامیاب اور ماہر نثر نگار ہی کامیابی سے خاکہ نگاری کر سکتا ہے کیوں کہ اسے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرنا ہوتا ہے۔ خاکہ نگاری کے لئے ضروری نہیں کہ اس میں جس شخصیت کا خاکہ پیش کیا جائے وہ کسی بھی طرح بلند پایہ اور مایہ ناز شخصیت ہو۔ لیکن اگر شخصیت دلچسپ ہوگی تو خاکہ بھی دلچسپ ہوگا۔ جو نثر نگار خاکہ نگاری کے فن میں مہارت رکھتے ہیں وہ غیر دلچسپ شخصیتوں کے خاکوں کو بھی اپنے کمالِ فن اور اسلوب سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ اس کی اچھی مثال بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے تحریر کردہ ''نام دیو مالی'' اور ''گدڑی کا لال...... نور خاں'' کے خاکے ہیں، جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دولت، شہرت اور نام ونمود میں ہی انسان کی بڑائی نہیں بلکہ انسانیت ہی سب سے اعلیٰ بڑائی ہے۔

جس طرح ایک مصور تصویر میں مناسب ترین رنگوں کا استعمال کرتا ہوا تصویر کی دلکشی اور جاذبیت میں غیر معمولی اضافہ کرتا ہے، اسی طرح ایک خاکہ نگار مناسب ترین الفاظ اور دلکش ومتاثر

---

[1] اصناف ادب اُردو ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم ص ۱۴۰

اندازِ بیان کے ذریعہ اپنے خاکے کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔

بہترین خاکہ وہی سمجھا جاتا ہے، جس میں خاکہ نگار حقائق کے بیان میں اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کو ترجیح نہ دے اور اپنی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرے۔ خاکے میں دلچسپی کے ساتھ قاری کے لئے کوئی سبق آموز پہلو بھی ہو۔

خاکہ نگاری کا آغاز وارتقاء

یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو زبان وادب کی تواریخ کے وجود میں آنے سے قبل تذکرہ نگاری اور بیاض نویسی کا رواج تھا۔ تذکرے ابتداء میں زیادہ تر فارسی میں لکھے گئے حتیٰ کے اُردو شعراء کے تذکرے بھی فارسی میں ملتے ہیں۔ ''تذکرۂ نکات الشعراء'' ۱۷۵۲ء، (میر تقی میرؔ) گلشن بے خار ۱۸۳۵ء، (شیفتہؔ) تذکرۂ ہندی (مصحفیؔ) تذکرۂ شعرائے اُردو جیسے مشہور تذکروں میں تذکرہ نگار شعراء نے اپنے عہد کے کئی شعراء کا ذکر کیا ہے۔ ان تذکروں میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔ بعدازاں اُردو تذکرے بھی لکھے گئے۔

محمد حسین آزاد کے تذکرہ ''آبِ حیات'' ۱۸۸۰ء کو تذکرہ نگاری کی آخری اور تاریخ ادب کی پہلی کڑی مانا جاتا ہے۔ اس میں بھی خاکہ نگاری کے نقوش واضح انداز میں ملتے ہیں۔ آزاد نے اپنے تذکرے میں شعراء کے رہن سہن، طرزِ معاشرت، وضع قطع، قدوخال، ملبوسات اور ان کی طرز زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

یوں تو اُردو زبان میں کئی ایک خاکہ نگاروں کے نام ملتے ہیں۔ شرر، رسوا، یلدرم وغیرہ لیکن ۲۰ویں صدی میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے ۱۹۲۷ء میں اپنے استاد کا خاکہ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبان'' کے عنوان سے اک طویل خاکہ لکھ کر خاکہ نگاری کے فن کو کافی بلندی بخشی اور اُردو کے اولین معیاری خاکہ نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد ہوتے ہوئے انھوں نے اپنے استاد کا خاکہ زیادہ سے زیادہ حقائق کے ساتھ بے جھجک انداز میں پیش کیا ہے۔

۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے گیارہ مختصر خاکوں کا مجموعہ شائع کیا جو'' کیا خوب آدمی تھا'' کے نام سے منظر عام پر آیا، جس میں اس دور کے قدآور ادبی شخصیتوں کے خاکے پیش کئے گئے۔

۱۹۴۳ء میں ''گفت وشنید'' کے نام سے بشیر احمد ہاشمی کی کتاب منظرِ عام پر آئی، جس میں مختلف پیشے سے تعلق رکھنے والوں کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا گیا لیکن یہ کتاب خاکہ نگاری کی تعریف پر پوری نہیں اُترتی۔

۱۹۴۵ء میں ''یادِایام'' کے نام سے عبدالرزاق کانپوری کی خاکہ نگاری سرسید اوران کے رفقاء سے متعلق ملتی ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری ''چند ہم عصر'' کے عنوان سے ملتی ہے، اس میں بھی انھوں نے اس دور کی قدآور شخصیتوں پر اپنے معیاری خاکے پیش کیے۔

رشید احمد صدیقی کی تصنیف ''گنج ہائے گرانمایہ'' کو خاکہ نگاری کے سلسلے میں اسم بامسمیٰ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ''ہم نفسانِ رفتہ'' بھی ان کا معروف مجموعہ ہے۔

آزادی کے بعد خاکہ نگاری کا جائزہ لیا جائے تو سینکڑوں خاکہ نگاروں کے نام ملیں گے جن میں سعادت حسن منٹو، فکر تونسوی، شوکت تھانوی اور عبدالماجد دریابادی کے نام قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ علی جواد زیدی، خواجہ احمد فاروقی اور عصر حاضر کے خاکہ نگاروں میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

اُردو میں خاکہ نگاری کے نمونے تذکروں کے علاوہ سوانح، سفرنامے، رپورتاژ اور مکاتیب بھی ملتے ہیں۔

انشائیہ

انشاء کے لغوی معنی عبارت لکھنا، طرزِ تحریر یا کوئی بات پیدا کرنا ہیں۔ اصطلاح میں انشائیہ اس جملے کو کہتے ہیں جس میں سچ اور جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔ انگریزی میں اسے personal Essay یا Light Essay کا نام دیا گیا ہے۔ انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے، جو انگریزی ادب سے لی گئی ہے۔ اس کی مکمل تعریف ناممکن ہے۔ انگریزی میں بھی اس کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ ان تمام کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ انشائیہ میں انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر اپنے ذاتی تاثرات اور نظریات کو بے تکلفانہ انداز میں پیش کرتا ہے، جس کی بنیاد اس کے تجربے اور مشاہدے پر ہوتی ہے۔ اس میں

اندازِ بیان ہلکا پھلکا ہوتا ہے، اسی لئے اسے Light Essay کہا گیا ہے۔ اس کی ذاتی رائے سے انشائیہ نگار کی پسند ناپسند یا اقدار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے چنانچہ اس صنف کو ذاتی شبیہہ کا نام بھی دیا گیا ہے۔

انگریزی ادیب جانسن نے انشائیہ کو ذہن کی آزاد ترنگ سے تعبیر کیا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ انشائیہ لکھنے کے کوئی مقررہ اُصول نہیں ہیں لیکن اس کے لئے زبان و بیان پر قدرت ضروری ہے کہ قاری کو ندرت اور شگفتگی کا احساس ہو۔ انشائیہ میں خیالات کا تسلسل اور ربط نہیں ہوتا، یہی سبب ہے کہ انشائیہ کو نثری غزل بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہی موضوع سے متعلق چیدہ چیدہ خیالات کو انشائیہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں ہی انشائیہ نگار بڑے کام کی بات کر جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین انشائیہ کو مضمون کی ایک قسم بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

"انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شئے پا لیتے ہیں۔ ایسی شئے جو روز کی سادہ و سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے، جو زندگی کی ٹھوس اور ناقابل انکار حقیقتوں اور صداقتوں میں اوجھل رہتی ہے"۔[1]

ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر خلیق انجم "اصناف ادب اُردو" میں لکھتے ہیں کہ انشائیہ لکھنے کا کوئی خاص اصلاحی مقصد نہیں ہوتا۔

انسائیکلوپیڈیا میں انشائیہ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے :

"اوسط لمبائی کا مضمون جس میں سہل اور سرسری انداز میں صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے"۔

ایک تا بیس صفحات پر مشتمل احساس شعریت اور نزاکت خیال کے ساتھ ساتھ اکثر انشائیوں میں طنزیہ و مزاحیہ انداز بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین اپنے مضمون "ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ" میں تحریر کرتے ہیں :

"انشائیہ نگاری کے لئے ظرافت نگاری لازمی ہے۔ ظرافت اس کا ایک شوخ

---

[1] اُردو نثر کا فنی ارتقاء ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اور چمکیلا رنگ ہے۔ اس کی زعفران زار سرزمین میں ہنسنے اور ہنسانے کے خوب مواقع ملتے ہیں''۔[1]

انشائیہ کا آغاز وارتقاء

ڈاکٹر جاوید وشٹ نے ملک الشعراء ملا وجہی کو سب سے پہلا انشائیہ نگار بتایا ہے :

''ملا اسداللہ وجہی دربار گولکنڈہ کا ملک الشعراء اور دکن کا قد آور شاعر و نثر نگار تھا اس نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر دکنی ادب کا پہلا شاہکار ''سب رس'' پیش کیا، یہ کتاب ہی انشائیے کا سرچشمہ ہے''۔[2]

سب رس کی عبارت ملاحظہ ہو، جس میں وجہی نے عقل سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے :

''عقل سوں چلتی خدا کی خدائی، جتنی عقل اتنی بڑائی...... عقل بغیر دل کوں نور نیں، عقل کو خدا کہنا بھی کچھ دور نیں''۔[3]

یہ اور بات ہے کہ وزیر آغا وجہی کو انشائیہ نگار نہیں مانتے۔ شمالی ہند میں سرسید احمد خاں کے کچھ مضامین بھی انشائیہ کہلانے کے مستحق ہیں، ان کے رفقاء کی عبارت میں کچھ کچھ انشائیہ کی جھلک ملتی ہے۔

محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' کے مضامین میں انشائیہ کی خصوصیات ملتی ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے بھی کچھ مضامین کا شمار انشائیہ میں ہوتا ہے۔ اُردو ادب میں سجاد انصاری انشائیہ نگار کی حیثیت سے شناخت رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے انشائیوں کے لئے عام اور معمولی موضوعات کا انتخاب کیا ہے جیسے مچھر، جھینگر کا جنازہ، الو اور دست پناہ وغیرہ لیکن اندازِ بیان کی شگفتگی، اپنی شخصیت کا اظہار اور دہلی کی ٹکسالی زبان ان کے انشائیوں کی شناخت ہے۔

---

1. اُردو نثر کا فنی ارتقاء ڈاکٹر فرمان فتح پوری
2. ملا وجہی کے انشائیے ڈاکٹر جاوید وشٹ ص ۱۳،۱۴
3. سب رس ملا وجہی

سجاد حیدر یلدرم نے اس صنف پر کم لکھا ہے لیکن جو بھی لکھا ہے، بہت بہتر لکھا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے انشائیوں میں مزاحیہ انداز ملتا ہے۔ اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی بے تکلفی سے اپنے مخصوص انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی بھی اس میدان میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مہدی افادی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، مشتاق احمد یوسفی، انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صنفِ ادب میں اپنی شناخت بنائی ہے۔

مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، پرویز یداللہ مہدی، عباس متقی اور حبیب ضیاء وغیرہ عصر حاضر کے معروف انشائیہ نگار مانے جاتے ہیں۔

سوانح نگاری

سوانح، سانحہ کی جمع ہے اس کے لغوی معنی واقعات، حادثات، روداد یا حالات کے ہیں۔ سانحہ کے معنی حادثے کے لئے جاتے ہیں جو یکسر ناپسندیدہ یا ناخوشگوار ہوتا ہے۔ لیکن اصطلاحاً سوانح نگاری یا سوانح عمری کے معنی کسی شخص کے حالاتِ زندگی لکھنے کے ہیں۔ انگریزی میں سوانح نگاری یا سوانح عمری کو Biography کہا گیا ہے جس کے معنی حیات نگاری کے ہیں۔ سوانح نگاری کا شمار تاریخ اور ادب دونوں میں ہوتا ہے۔

سوانح نگاری سے مراد ایسا مضمون جس میں کسی شخص کے حالات اور اس کی شخصیت کو بڑے تفصیلی انداز میں اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی زندگی کا ہر گوشہ یا پہلو سامنے آجائے، سوانح نگاری کہلاتی ہے۔

ابتداء میں اسے سیرت نگاری بھی کہا گیا اس کی عمدہ مثال شبلی نعمانی کی ''سیرت النبیؐ'' ہے۔ عموماً سوانح نگاری میں دُنیاوی یا دینی اعتبار سے معروف ہستیوں کے حالاتِ زندگی، ان کی سیرت اور کارناموں کی روداد پیش کی جاتی ہے۔ اس میں سوانح نگار کسی کے حالاتِ زندگی کو بالکل ہی سادہ یا روکھے پھیکے انداز میں بیان نہیں کرتا بلکہ اس میں اپنی فنکاری کا بھی اظہار کرتا ہے۔ سوانح نگاری زیادہ سے زیادہ حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔ ہر انسان کی زندگی چھوٹے بڑے، اہم اور غیر اہم واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ لیکن سوانح نگار اس کی زندگی کے تمام واقعات کو ترتیب وار پیش نہیں کرتا بلکہ ایسے

واقعات کا انتخاب کرتا ہے جو اس کے کردار کی بہترین عکاسی کرتے ہیں جس سے اس کے کردار کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ سوانح نگار ان واقعات کی ترتیب میں اپنا کمال دکھاتا ہے کہ وہ حقیقتاً بے ترتیب ہوتے ہوئے بھی ترتیب وار دکھائی دیتے ہیں۔

انگریزی کے مشہور ادیبوں نے بھی سوانح نگاری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اُردو ادیبوں نے بھی اس طرح کی کوششیں کی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ سوانح نگاری صاحبِ سوانح سے متعلق معلومات میں کافی اضافہ کرتی ہے۔ یہ مشکل ہے کہ کسی کی سوانح حیات، صاحبِ سوانح کی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے پیش کردے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ صاحبِ سوانح کو قاری سے بہت قریب کر دیتی ہے۔

کچھ ادیبوں کا کہنا ہے کہ سوانح نگاری میں صرف صاحبِ سوانح کی زندگی ہی بیان نہیں کی جاتی بلکہ اس کے دور کی تہذیب و ثقافت کو بھی اس میں شامل کر لیا جاتا ہے۔

ابتداء میں سوانح عمری یا سوانح حیات میں صاحبِ سوانح کے حالات و واقعات زندگی کو سادگی کے ساتھ بیان کر دیا جاتا تھا لیکن عصر حاضر میں سوانح نگاری بھی ایک فن کی حیثیت سے اُبھری لہٰذا صاحبِ سوانح کی سیرت، اس کی شخصیت کے خدوخال اور اس کے کردار کو اس عہد کی تہذیب و معاشرت کے آئینے میں دیکھا جانے لگا۔

جب سوانح نگاری بحیثیت فن منظر عام پر آئی تو سوانح نگار نے بھی فنکار کی حیثیت سے ذمہ داری قبول کی۔ حقیقت نگاری، غیر جانبداری، واقعات کا انتخاب، ان کی ترتیب اور اپنے دلچسپ اندازِ بیان سے سوانح نگاری کو بے انتہا دلچسپ بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ سوانح نگاری تاریخ اور ادب دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔

اچھا سوانح نگار غیر جانبداری سے کام لیتا ہوا صاحبِ سوانح کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔

جدید نفسیات کے سبب صاحبِ سوانح کی باطنی کیفیت تک پہنچنے کی راہیں ہموار ہو گئیں چنانچہ اب حالات سے زیادہ سیرت نگاری پر توجہ دی جا رہی ہے۔

اچھا سوانح نگار یہ کوشش کرے گا کہ صاحب سوانح کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر قاری کے آگے پیش کرے۔

اُردو میں سوانح نگاری کا آغاز و ارتقاء

اُردو میں حالؔی اور شبلؔی کو اولین سوانح نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حالؔی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں حیاتِ سعدی ۱۸۸۴ء، حیاتِ جاوید اور یادگار غالبؔ ۹۷-۱۸۹۶ء کے عنوان سے اُردو ادب میں اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ اول الذکر سوانح حالی نے فارسی کے بلند پایہ شاعر سعدؔی شیرازی سے متعلق لکھی ہے۔ حیاتِ جاوید میں حالی نے سرسید کی حیات اور ان کی متاثر کن شخصیت کو پیش کیا ہے اور یادگار غالب میں بڑے تفصیلی انداز سے اپنے استاد کی حیات و شخصیت کو قلم بند کیا ہے۔

حالؔی نے اس وقت سوانح نگاری کا آغاز کیا جب کہ اُردو میں اس کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ اس طرح حالؔی اولین سوانح نگار مانے جاتے ہیں۔ بعد ازاں شبلی کی سوانحی تصانیف المامون ۱۸۸۹ء، سیرت النعمان ۱۸۹۱ء، الفاروق ۱۸۹۸ء، سوانح مولانا روم ۱۹۰۲ء، الغزالی ۱۹۰۲ء کے علاوہ سیرۃ النبیؐ ۱۹۱۰ء، ان کے مایہ ناز کارنامے ہیں اگرچہ یہ ان کی زندگی میں پایہ تکمیل کو نہ پہنچی۔ ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل کی۔

ان تصانیف کے پیش نظر حالؔی اور شبلؔی کو سوانح نگاری کا امام کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اگر چہ جدید سوانح نگاری کے اُصولوں اور طرزِ نگارش پر ان کی سوانح عمریاں پوری نہیں اُترتیں لیکن اس کے باوجود یہ تصانیف اُردو کا وقیع سرمایہ سمجھی جاتی ہیں اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابلے میں انھیں پیش کیا جاسکتا ہے۔

حالی اور شبلؔی نے انگریزی ادب سے یقیناً استفادہ کیا ہے۔ جس کا اندازہ ان کے دیباچوں سے ہوتا ہے۔

حالؔی اور شبلؔی سے قبل سوانح نگاری کے کچھ کچھ نقوش دکن کی مثنویوں میں ملتے ہیں جیسے ابراہیم نامہ، علی نامہ اور تاریخ اسکندری وغیرہ بعد ازاں اُردو کے تذکروں میں شعراء سے متعلق مختصر ترین معلومات جو تذکرہ نگاروں نے پیش کیے ہیں، ان میں سوانحی نقوش کی جھلک ملتی ہے۔ اس سلسلے میں

تذکرہ نگاری کی آخری کڑی ''آبِ حیات'' کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ سرسید احمد خاں کی تصانیف آثار الصنادید، خطباتِ احمدیہ اور سیرتِ فریدیہ میں بھی سوانح نگاری کے نقوش ملتے ہیں۔ اس کے بعد حاؔلی اور شبلؔی کا شمار تو سوانح نگاری کے معماروں میں ہوتا ہے۔

حاؔلی اور شبلؔی کے بعد اس دور کے کئی سوانح نگاروں کے نام ملتے ہیں، جن میں مرزا حیرت دہلوی، احمد حسین اکبر آبادی اور عبدالرزاق کانپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اپنی سوانحی تصانیف سے فن سوانح نگاری کو باقی رکھا۔ غلام رسول مہر کی سوانح ''غالبؔ'' اور مالک رام نے ''ذکرِ غالبؔ'' کے عنوان سے سوانحی تصانیف پیش کیں۔

۱۹۵۰ء میں صالحہ عابد حسین نے ''یادگارِ حاؔلی'' کے عنوان سے حاؔلی پر باقاعدہ اور جامع سوانح لکھی، جس میں حاؔلی کے حالات، سیرت اور ان کے کلام پر تبصرہ ملتا ہے۔ عبدالمجید سالک نے ''ذکرِ اقبالؔ'' کے تحت علامہ اقبالؔ کی شخصیت کا مکمل جائزہ لیا ہے۔

خودنوشت سوانح عمری

خودنوشت میں مصنف خود ہی صاحبِ سوانح ہوتا ہے، جس میں وہ خود اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتا ہے۔ اپنی ذات اور شخصیت کو مصنف بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ آپ بیتی اور خودنوشت سوانح کا فرق بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان اپنی سوانح خود لکھ سکتا ہے لیکن آپ بیتی لکھنا اتنا آسان نہیں کہ دوسروں کا خوف اور خود اپنی ذات سے محبت اسے ان تمام باتوں کو من وعن بیان کرنے میں مانع ثابت ہوتی ہیں جو اس پر بیت چکی ہیں۔ لہٰذا شائد ہی کوئی آپ بیتی زیادہ سے زیادہ حقائق کا احاطہ کرتی ہو۔

خودنوشت سوانح عمریوں میں مکمل اور نامکمل ہر دو طرح کی سوانح عمریاں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب صاحبِ سوانح اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ کر اپنی سوانح عمری قلمبند کرے گا تب بھی اس کی حیثیت مکمل سوانح کی نہیں ہوگی اور اگر صاحبِ سوانح اپنی زندگی کے کسی ایک پہلو یا مخصوص واقعات کو منظر عام پر لانے کے لئے سوانح تحریر کرے گا تب بھی یقیناً اس کی سوانح نامکمل تصور ہوگی۔

اُردو میں خودنوشت سوانح کا آغاز وارتقاء

سوانح نگاری کی طرح خودنوشت سوانح عمریوں کے بھی ابتدائی نقوش دکنی مثنویوں میں ملتے ہیں، جہاں مثنوی گوشاعر مثنوی کے آغاز پر اپنے کچھ حالات قلم بند کرتا ہے علاوہ ازیں سفرناموں یا روزنامچوں میں بھی خودنوشت سوانح کے نقوش ملتے ہیں۔قدیم صنف تذکرہ نگاری میں بھی تذکرہ نگار سے متعلق کچھ واقعات مل جاتے ہیں۔ان کے علاوہ مثنویوں کے آغاز میں بھی شاعر سے متعلق خود نوشت سوانح کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

۱۴ویں صدی کے آغاز میں عبدالغفور نساخ کی لکھی ہوئی خودنوشت ''سوانح عمری'' بھی ملتی ہے جوایک عرصۂ دراز تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہوسکی۔

شہر بانو بیگم کی ''بیتی کہانی'' بھی ۱۸۸۵ء کی تصنیف ہونے کے باوجود عرصۂ دراز تک شائع نہ ہوسکی۔ یہ تو خودنوشت سوانح عمریوں کے ابتدائی نقوش تھے لیکن ۲۰ویں صدی میں بیسویوں سوانح عمریوں کے نام ملتے ہیں، جن میں جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' ۱۹۷۰ء، رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری''، احسان دانش کی ''جہاں دانش'' ۱۹۷۵ء، مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' اُردوادب میں شہرت رکھتے ہیں۔

خطوط نگاری یا مکتوب نگاری

خط کو آدھی ملاقات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔خط لکھنے کی ضرورت اسی وقت محسوس کی جاتی ہے جب مکتوب الیہ اتنا قریب نہ ہو کہ اس سے بالمشافہ گفتگو کی جاسکے۔چنانچہ خط لکھنے والا اپنے خیالات، احساسات اور واقعات کو خط کے ذریعہ مکتوبِ الیہ تک پہنچاتا ہے۔تمام اصناف میں خطوط کو نجی صنف سمجھا گیا ہے۔جس میں خط لکھنے والے کے پیش نظر مکتوب الیہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا لہٰذا وہ بلاتکلف اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کے خطوط کبھی شائع ہوکر منظر عام پرنہیں آئیں گے۔

خط لکھنے کے کوئی خاص اُصول مقرر و معین نہیں ہیں۔ ہر شخص کا اپنا طرزِ تحریر ہوتا ہے اور یہ انداز ہی اس کی شخصیت کی پہچان بن جاتا ہے۔یہ اور بات ہے کہ مکتوب الیہ کی شخصیت اور اس کی عمر

کی مناسبت سے القاب و آداب کا استعمال ہوتا ہے۔ ساتھ ہی چھوٹوں کے لئے خلوص و محبت اور شفقت جھلکتی ہے تو بزرگوں کے لئے نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے اور وہیں اپنے برابرداروں اور دوستوں کے لئے بے تکلفانہ انداز ملتا ہے۔ مکتوب نگاری یا خطوط نگاری میں چوں کہ ہر مکتوب نگار کا اپنا منفرد انداز ملتا ہے لہٰذا خطوط، لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ تصور ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سوانح نگار کو صاحب سوانح کے خطوط یا مکاتیب سے اس کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ خطوط کا کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا، اس میں کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کیا جاسکتا ہے۔

خطوط نگاری کا آغاز وارتقاء

اُردو میں خطوط نگاری کی روایت دوسری اصناف کی طرح عربی اور فارسی کے بعد ملتی ہے۔ ابتداء میں عربی میں خطوط لکھے جایا کرتے تھے، سلاطین اپنے قاصدوں کے ذریعہ ایک دوسرے کو خطوط بھیجتے۔ عربی سے فارسی میں یہ روایت در آئی لیکن فارسی خطوط کا اندازِ تحریر جداگانہ تھا جس میں القاب و آداب ہی کئی سطور پر مشتمل ہوتے۔

جب ڈاک یا ترسیل کی سہولت ہوئی تو خطوط نویسی کا رواج عام ہوا۔ لیکن عہدِ قدیم میں خطوط کی عبارت مرصع و مسجع ہوا کرتی۔ نثر کی عبارت میں بھی ردیف اور قافیہ کا التزام ہوتا اور اندازِ بیان بھی نہایت پر تکلف ہوتا۔ لیکن مرزا غالبؔ نے مکتوب نگاری کے ان اُصولوں سے انحراف کیا۔

مرزا غالبؔ کو اُردو مکتوب نگاری کا امام کہا جائے تو حق بہ حقدار رسید کے مترادف ہوگا کہ ۱۸۵۰ء میں مرزا غالبؔ نے اُردو مکتوب نگاری کا آغاز کیا۔ یہ خطوط انھوں نے تاریخ تیموریہ (جو بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر لکھی جارہی تھی) کے تھکا دینے والے کام سے اپنے ذہن کو آرام دینے کی خاطر لکھے، جنھیں لکھتے وقت مرزا غالبؔ کے تصور میں بھی یہ بات نہ آئی کہ ان خطوط کے سبب ان کا شمار اُردو کے بلند پایہ نثر نگاروں میں ہوگا اور ان کے خطوط اُردو نثر کی تاریخ میں اک نئے باب کے اضافے کے ضامن ہوں گے۔

مرزا غالبؔ کے خطوط سے اُردو نثر کو جو سادگی اور پرکاری میسر آئی، اس سے قبل اُردو اس سے محروم تھی حتیٰ کہ سرسید جسے جدید اُردو نثر کا بانی مانا جاتا ہے، انھیں بھی مرزا غالبؔ کے خطوط کے

سبب ہی سادہ نثر کے نمونے ملے۔ مرزا غالبؔ کے خطوط کے مجموعے "عود ہندی"، "اُردوئے معلّیٰ"، "خطوطِ غالبؔ" اور "نادراتِ غالبؔ" کے عنوان سے ملتے ہیں۔ ان مجموعوں میں دستیاب خطوط اپنی کئی خصوصیات کی بناء پر اُردو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔

خصوصیاتِ خطوط غالبؔ

قدیم القاب و آداب کا ترک

مرزا غالبؔ نے سب سے پہلے فارسی خط و کتابت کی روایت کو ختم کر کے اُردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کیا اور فارسی مکتوب نگاری کے اُصولوں سے انحراف کرتے ہوئے طویل القاب و آداب جیسی تکلیف دہ رسم سے اُردو مکتوب نگاری کو نجات دلائی۔ لہٰذا وہ جس سے مخاطب ہوتے اس کے مرتبے اور مقام کی مناسبت سے بہت مختصر اور برجستہ الفاظ استعمال کرتے۔ کبھی "برخوردار" کبھی "مہاراج"، کبھی "بھائی صاحب" اور کبھی "میاں خوش رہو" جیسے الفاظ بطورِ القاب استعمال کرتے۔ لیکن بعض اوقات تمہید کے بغیر ہی اپنا مدعا بیان کر دیتے۔

مراسلے کو مکالمہ بنانا

مرزا غالبؔ خود اپنے شاگرد مرزا حاتم علی مہرؔ کے خط میں لکھتے ہیں : "میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا" اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں : "ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو" مرزا غالبؔ نے اپنی جدت طبع سے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ یعنی جب ان کے خطوط پڑھے جاتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ آپس میں محوِ گفتگو ہیں۔

شوخی و ظرافت

مرزا غالبؔ کے مزاج کی رنگینی کو نہ صرف ان کی شاعری میں دخل ہے بلکہ ان کی نثر بھی اس سے عاری نہیں۔ مرزا غالبؔ کے خطوط سے یقیناً اُردو نثر میں پہلی مرتبہ شوخی و ظرافت کے نمونے ملے اس سے متعلق حالیؔ لکھتے ہیں کہ مرزا غالبؔ کے خطوط کی شوخی و ظرافت نے ہی انھیں ناول اور ڈرامہ کی طرح دلچسپ بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ پڑھنے والا ان خطوط سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ مثلاً

ایک دوست کو ماہ رمضان میں خط لکھتے ہیں : ''دھوپ بہت تیز ہے روزہ رکھتا ہوں، مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا، کبھی حقہ پی لیا تو کبھی ٹکڑا روٹی کا کھالیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں، میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے''۔

لطیفہ گوئی

مرزا غالبؔ کا شائد ہی کوئی خط ایسا ہوتا جس میں کوئی لطیفہ نہ بیان کیا گیا ہو۔ ایک دوست کو ڈسمبر ۱۸۵۸ء کی آخری تاریخ کو خط لکھا، جس کا جواب انھوں نے ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو بھیجا۔ اس کے جواب میں مرزا غالبؔ انھیں لکھتے ہیں :

> ''دیکھو صاحب یہ باتیں ہم کو پسند نہیں، ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزہ یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہی کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے''۔

ان خطوط کو لکھتے وقت مرزا غالبؔ کے ذہن میں ہرگز یہ بات نہیں تھی کہ ان کے خطوط نہ صرف شائع کئے جائیں گے بلکہ غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلیں گے۔ یہی سبب ہے کہ ان میں کسی قسم کا تصنع نہیں ملتا۔ لہجے میں بے ساختگی اور تحریر میں بے تکلفی ملتی ہے۔ مرزا غالبؔ کے ان ہی خطوط کے سبب ان کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویر قاری کے ذہن میں اُبھرتی ہے۔ ان سوانح نگاروں کے لئے جنھوں نے مرزا غالبؔ کی سوانح عمری لکھی یہ خطوط بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوئے۔ نہ صرف ادبی بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی ان کے خطوط اس لئے اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں مرزا نے اپنے عہد کو سمویا ہے یعنی غدر کے دوران دہلی کے اندوہناک حالات کی پردرد تصویر بھی پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں :

> ''یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں، ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا

ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا"۔

مرزا غالبؔ کے علاوہ سر سید احمد خاں، علامہ شبلیؔ، مولانا حالیؔ، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبالؔ کے خطوط اُردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ ان کے علاوہ کئی ادیبوں کے خطوط کو ادبی سرمائے کی حیثیت حاصل ہے۔

نجی اور ذاتی خطوط کے علاوہ دفتری، سرکاری اور کاروباری یا تجارتی خطوط بھی ملتے ہیں، جن کی نوعیت نجی خطوط سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط کو یقیناً ادبی سرمایہ قرار دینا ناگزیر ہے کیوں کہ عصرِ حاضر میں خطوط نگاری کا رواج معدوم ہو رہا ہے۔ ترسیل کے ذرائع کی تیز رفتار ترقی نے خطوط نگاری کو روبہ زوال کیا ہے۔ ای-میل، ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ کی سہولت نے جہاں انسان کو خط لکھنے کی زحمت سے بچالیا، وہیں ایک ادبی صنف کے نقوش بھی ماند پڑ گئے۔

سفرنامہ

اُردو کے نثری اصناف میں سفرنامے کو بھی ایک صنف کی حیثیت حاصل ہے۔ اس صنف کا شمار اُردو کے قدیم ترین اصناف میں ہوتا ہے۔ سفرنامہ میں کسی بھی سفر کی روداد کو تفصیلی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں سفر کرنے والا اپنے مزاج، اپنی صلاحیت اور اپنی یادداشت کے مطابق سفرنامہ قلم بند کرتا ہے۔ سفرنامہ لکھنے یا قلمبند کرنے کے کوئی خاص اُصول مقرر و متعین نہیں ہے۔ سیاح اپنے سفر کی روداد کو بیانیہ انداز میں قلم بند کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاحوں نے سفرنامہ کو قلم بند کرنے کے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے حافظے یا یادداشت کے سہارے ہی اپنا سفرنامہ قلم بند کرتے ہیں لیکن کچھ سیاحوں کا طریقہ کار یہ رہا کہ دورانِ سفر جو واقعات وقوع پذیر ہوئے یا ان کے اپنے تجربات یا تاثرات کو انھوں نے اپنی ڈائری یا خطوط کی شکل میں تحریر کرلیا اور سفر کے اختتام پر جب وہ اپنے وطن واپس ہوئے، انھیں رہنمایانہ خطوط کی مدد سے اپنا سفرنامہ قلم بند کیا۔

سفرنامے کا شمار ادبی اصناف میں اسی وقت ہوگا جب سیاح اپنے سفر میں درپیش منتخب واقعات کو ترتیب وار پیش کرے۔ منتخب کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کہ اس میں غیر اہم واقعات کے بیان سے گریز کیا جاتا ہے۔ سفرنامے کی زبان نہایت سادہ سلیس اور رواں ہوتی ہے تاکہ قاری بہ آسانی اسے سمجھ سکے۔ واقعات کے بیان کی مناسبت سے زبان کا بھی استعمال ہو۔ سفرنامے کا انداز بیان اس قدر بہترین ہو کہ قاری بھی اپنے آپ کو سیاح کا ہم سفر سمجھنے لگے۔

سفرنامہ کی تحریر کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو تجربات، مشاہدات اور تاثرات کے علاوہ جغرافیائی ماحول اور تاریخی حالات سے واقف کروایا جائے۔ سیاح اپنے سفر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے دورانِ سفر پیش آئی ہوئی دشواریوں یا سہولتوں کو بھی بیان کرتا ہے جسے پڑھ کر قاری اپنے ملک میں رہتے ہوئے دوسرے ممالک کے سماجی، سیاسی، جغرافیائی اور تہذیبی حالات سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں ٹی-وی اور انٹرنٹ کی بدولت انسان گھر بیٹھے ہی ساری دُنیا کی سیر کا لطف اُٹھا سکتا ہے۔ بیرونی ممالک کے حالات حتیٰ کہ وہاں کے موسموں سے متعلق بھی جانکاری رکھتا ہے۔ لہٰذا عصر حاضر کے سفرناموں میں سفر کی کیفیت بیان کرنے پر توجہ دی جارہی ہے۔

سفرنامے کا آغاز وارتقاء

انسان ابتداء ہی سے فطرتاً تغیر اور تبدیلی کو پسند کرتا ہے۔ تجسس اس کی سرشت میں ہی موجود ہے اور اسی کے سبب حضرت آدم کو بھی جنت چھوڑنی پڑی۔ عہد قدیم میں اگرچہ سفر کرنے کی اتنی سہولت نہیں تھی۔ عصر حاضر کی طرح بری سفر کا تصور بھی دشوار تھا، بحری سفر ہی ایک واحد ذریعہ تھا جس کے لئے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا۔

سب سے پہلا سفرنامہ جو منظر عام پر آیا وہ یونانی سیاح میگا ستھینز کا سفرنامہ ہند یا indical ہے۔ میگا ستھینز چندر گپت موریا کے عہد حکومت ۳۳۰ ق-م میں ہندوستان آیا، یہ سفرنامہ معلوماتی ہے، جس میں اس دور کے ملکی، سماجی اور انتظامی حالات کی تفصیل ملتی ہے۔

سفرناموں کے سلسلے کا دوسرا نام ''بدھ حکومت کے حالات'' فاہیان کا لکھا ہوا سفرنامہ ہے فاہیان کے چین سے ہندوستان آنے کا مقصد یہی تھا کہ یہاں کے مقدس مقامات کا سفر کرے اور

بدھ مت کی تعلیم حاصل کرے۔

ہیون سانگ نے بھی ۶۳۰ء میں مذہبی مقصد کے تحت ہندوستان کا سفر کیا اور ہندوستان کے حالات قلم بند کیے۔ سلیمان پہلا عرب تاجر تھا، جس نے ہندوستان کا سفر کیا اور اپنا سفر نامہ ''سلسلہ التواریخ'' کے نام سے ۱۸۴۵ء میں پیش کیا۔ جس کے بعد کئی اور سفرنامے لکھے گئے۔

ہندوستان آنے والے سیاحوں ابوریحان میں البیرونی کے نام کی شہرت زیادہ ہے۔ جو محمود غزنوی کے دورِ حکومت ۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء میں وسط ایشیاء سے ہندوستان آیا۔ البیرونی نہ صرف سیاح کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے بلکہ کئی حیثیتوں سے یہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا سفر نامہ ''کتاب الہند'' کے نام سے ملتا ہے۔

بیرونی سیاحوں میں ایک اہم نام ابن بطوطہ کا ہے، جس نے ساری دُنیا کا سفر کیا اور ۱۳۴۷ء میں محمد بن تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا۔ بعد ازاں اپنے وطن مراقش واپس ہونے کے بعد سفر نامہ ''عجائب الاسفار'' لکھا جو منظر عام پر آیا۔

یورپین قوم کی ہندوستان میں آمد پر پہلا نام مارکو پولو کا ملتا ہے، اس کا سفر نامہ کافی شہرت رکھتا ہے۔ اُردو میں سفر ناموں کی ابتداء ۱۹ویں صدی سے ہوئی۔ اس سلسلے کا پہلا سفر نامہ ''عجائبات فرنگ'' کے نام سے یوسف خاں کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں تحریر کیا، جو انگلستان کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے، اس کے بعد اُردو میں بیسوں سفرنامے لکھے گئے۔ خود سرسید کا سفر نامہ ''مسافرانِ لندن'' بھی کافی شہرت رکھتا ہے۔ ۲۰ویں صدی میں تو بے شمار سفرنامے لکھے گئے، جن کے ناموں کی فہرست بھی تفصیل طلب ہے۔ شبلی، محمد حسین آزاد، عبدالماجد دریابادی، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، خواجہ حسن نظامی، سلیمان ندوی جیسی شخصیتوں کے سفرناموں کے علاوہ کئی اور شخصیتوں کے سفرنامے اُردو ادب کا حصہ ہیں۔

رپورتاژ

لفظ رپورتاژ سے متعلق شمیم احمد لکھتے ہیں کہ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہے، جس کا تعلق انگریزی لفظ رپورٹ سے ہے۔ یہ لفظ رپورٹ کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی

کے کہنے کے مطابق یہ لفظ اطالوی زبان سے فرانسیسی اور پھر انگریزی میں داخل ہوا۔ انگلش ڈکشنری میں اس کے معنی رپورٹ یا رپورٹ کا مواد کے ہیں۔ رپورتاژ کا تعارف اس طرح کیا جاتا ہے کہ کسی جلسے کی ایسی رپورٹ جس میں لکھنے والا اپنا آنکھوں دیکھا حال چھوٹی چھوٹی باتیں جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہو، رپورتاژ کہلاتا ہے۔

روداد اور رپورتاژ دونوں کسی قدر مختلف ہیں۔ روداد میں واقعہ کی رپورٹ سیدھے سادے انداز میں بغیر کسی ادبی چاشنی کے پیش کی جاتی ہے، جس سے پڑھنے والا جانکاری تو حاصل کرتا ہے لیکن لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ اس کے برخلاف رپورتاژ میں ناول یا افسانے کے انداز میں ایسی رپورٹ پیش کی جاتی ہے جو اپنی ادبی چاشنی کے سبب دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے، جو قاری کے لئے تفریح طبع کا باعث ہوتا ہے۔

رپورتاژ نگار کسی بھی جلسے یا تقریب کی روداد کو سرسری طور پر بیان نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا عمیق مشاہدہ کرتا ہے۔ واقعہ کو اس کی جزئیات کے ساتھ بیان کرتا ہے جس میں قاری کے اپنے جذبات اور تاثرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ رپورتاژ کے کردار، ناول یا افسانے کے مقابلے میں حقیقی ہوتے ہیں اسے نثری بیانیہ بھی کہا جاتا ہے لیکن نثری بیانیہ سے رپورتاژ کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ رپورتاژ میں نیاپن طنز و مزاح کی چاشنی، واقعات کا دلچسپ بیان ملتا ہے۔

گزرے ہوئے واقعات کے بیان کے سبب تاریخ سے بھی اسے نسبت دی جاتی ہے کہ تاریخ میں بھی گزرے ہوئے واقعات کا بیان ملتا ہے لیکن دونوں کے انداز بیان میں قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے۔ عبدالعزیز اپنے مضمون ''ترقی پسند تحریک اور رپورتاژ'' میں رپورتاژ کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ صنف بتاتے ہیں اور لکھتے ہیں :

> ''ترقی پسند ادبی تحریک اور رپورتاژ کا رشتہ ماں بیٹے کا ہے۔ تحریک سے پہلے رپورتاژ کی کوئی صورت اس قدر واضح اور نمایاں نہیں تھی۔ صحافت کا گو کہ عروج تھا لیکن اس میں صرف بے رنگ رپورٹ کی گنجائش تھی۔ ضرورت تھی ایسے اسلوب اور تکنیک کی کہ انسانیت کا نیا پیغام ذہنوں پر نقش ہو جائے، رپورتاژ

نے یہ کردار ادا کیا"۔[1]

سجاد ظہیر کے لکھے ہوئے رپورتاژ "یادیں" کو اُردو کا پہلا رپورتاژ مانا جاتا ہے، جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ترقی پسند تحریک کے جلسے کی رپورٹ ہے۔ عبدالعزیز "ترقی پسند تحریک اور رپورتاژ" مضمون کے تحت رپورتاژ کو ترقی پسند تحریک کے تحت وجود میں آنے والی صنف بتاتے ہیں۔ اس تحریک کے تحت منعقد ہونے والے جلسوں اور کانفرنسوں کی رپورٹ کو رپورتاژ کے نام سے لکھا گیا۔ یہی سبب ہے کہ سجاد ظہیر کا رپورتاژ اُردو کا پہلا رپورتاژ قرار پاتا ہے۔

کرشن چندر کا رپورتاژ "پودے" کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ یہ ۱۹۴۵ء میں منعقد ہوئی انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس سے متعلق ہے۔ اس زمانے میں بمبئی سے ہفت روزہ رسالہ "نظام" نکلا کرتا تھا۔ یہ رپورتاژ ابتدا اسی میں شائع ہوئے۔ "پودے" میں بمبئی سے حیدرآباد تک کرشن چندر کے سفر کی بھی تفصیل ملتی ہے۔ حیدرآباد میں محبوب حسین جگر سے ملاقات اور ان سے تاثر قبول کرنے کی روداد بھی قلم بند کی گئی ہے۔

پرکاش پنڈت کا رپورتاژ "کہت کبیر سنو بھئی سادھو" کے نام سے ملتا ہے جس میں کلکتہ میں منعقد ہونے والی کانفرس کی تفصیل ملتی ہے۔

عصمت چغتائی کا رپورتاژ "بمبئی سے بھوپال تک" اور صفیہ اختر کا رپورتاژ "ایک ہنگامہ" کے عنوان سے ملتا ہے جس میں بھوپال میں منعقد کانفرنس کی رپورٹ پیش کی گئی ہے۔ عصمت چغتائی کا انداز شوخی آمیز ہے اور صفیہ اختر نے سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ملک کے مختلف مقامات پر ہوئی کانفرنسوں سے متعلق مختلف ادبی شخصیتوں نے رپورتاژ لکھے۔ ملک کی تقسیم کے المیے پر بھی کئی رپورتاژ لکھے گئے، جس میں فکر تونسوی کا "چھٹا دریا"، ابراہیم جلیس کا "دو ملک ایک کہانی" اور خدیجہ مستور کا "پو پھٹے" اُردو ادب میں شہرت رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا رپورتاژ جن کے نام اور موقع تحریر سے متعلق پڑھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ رپورتاژ لکھنے کے لئے کوئی ہنگامہ، تہلکہ، کوئی کانفرنس یا جلسہ ناگزیر ہے اس کے بغیر پرسکون

---

[1] ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر ترتیب پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی ص ۵۲۱

حالات میں رپورتاژ کا تصور بے جا ہے۔ کسی بھی طرح کی ہنگامی کارروائی یا تحریک کی تفصیلات کو رپورتاژ اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے۔ اس میں جنگ، حادثات، فسادات اور تہذیبی جلسوں اور تقاریب کی تفصیلات کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

مضمون نگاری

لفظ مضمون لغت میں مطلب یا معنی کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی وہ عبارت یا تحریر جو کسی خاص بحث پر لکھی جائے مضمون کہلاتی ہے۔ مضمون آفرینی کے معنی ذہن سے نئی بات نکالنے اور نئی بات پیدا کرنے کے ہیں۔ مضمون نویسی کے معنی مضمون نگاری کے ہیں۔ مضمون نگاری اُردو نثر کی ایک صنف ہے لیکن مضمون باندھنا، مضمون خیال میں آنا، مضمون ڈھلنا، مضمون پھیکا ہونا، مضمون مبتذل ہونا اور مضمون ادا کرنا یہ الفاظ یا اصطلاحیں شاعری کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

نثر میں مضمون نگاری ایسی صنف ہے جو انشائیہ سے قریب ہوتی ہے لیکن انشائیہ اور مضمون میں فرق ہوتا ہے۔

دہلی کالج کے سلسلے میں اس بات کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر اس کالج کے روح رواں بن چکے تھے۔ ان کی صدارت میں کالج میں ایک ''لٹریری سوسائٹی'' کا ۱۸۴۲ء میں قیام عمل میں آیا۔ سوسائٹی کا مقصد یہی تھا کہ تصنیف و تالیف کا کام کافی تیزی سے ہو سکے۔ سوسائٹی کے مرکزی کردار ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی تھے۔ اس دوران کالج میں بڑی تیز رفتاری سے تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا۔

ماسٹر رام چندر سے مضمون نگاری کو منسوب کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کے تحت تصنیف و تالیف کے کام کے دوران انھوں نے مضامین بھی لکھے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ماسٹر رام چندر سے متعلق تحریر کرتے ہیں :

> ''اُردو کو جوان کی ذات سے فائدہ پہنچا وہ عدیم المثال ہے، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سائنس وغیرہ پر بلیغ مضامین لکھ کر اُردو میں انشائیہ کی بنیاد قائم کی۔ متعدد اخبارات کے ذریعہ سے انھوں نے اُردو کو علمی و ادبی مضامین سے

روشناس کرایا۔ انھوں نے نہ صرف خود ہی اُردو کو مالا مال کرنے کے لئے خامہ فرسائی کی بلکہ اپنے ارد گرد ایسے ارباب ذوق کا حلقہ بنالیا تھا جو اُردو کے ممتاز معمار سمجھے گئے۔ محمد حسین آزاد، نذیر احمد، ذکا اللہ سب ان کی شاگردی سے فیض یاب ہوئے"۔ [1]

بعد ازاں علی گڑھ تحریک کے زیر اثر دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری بھی پروان چڑھی۔ سر سید احمد کو جدید اُردو نثر کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح مضمون نگاری کے سلسلے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ مضمون نگاری کا فروغ چھاپہ خانوں کے سبب ہوا۔ مضمون میں اختصار کے ساتھ کسی بھی مسئلے پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے اور یہ افسانے کی طرح اتنا مختصر ہوتا ہے کہ ایک ہی نشست میں پڑھ لیا جاسکتا ہے۔

سر سید مختلف رسالے اور اخبار نکالا کرتے تھے۔ سائنٹفک سوسائٹی گزٹ کے نام سے بھی انھوں نے ایک رسالہ جاری کیا، جس میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے جایا کرتے تھے۔ سر سید کے رسالے "تہذیب الاخلاق" میں بھی مختلف موضوعات پر اس وقت کے بہترین لکھنے والوں نے اپنے اپنے مضامین پیش کئے ہیں۔ یہ مضامین تہذیبی، سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا احاطہ کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے سبب اُردو مضمون نگاری کو بے حد فروغ ہوا اور وہ ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت سے اُردو میں رواج پائی۔

مضمون نگاری اُردو نثر کی صنف کے ساتھ ساتھ ایک فن بھی ہے۔ مضمون نگار کے پاس نہ صرف وسیع معلومات ہوں بلکہ اس کے اظہار کے لئے ذخیرۂ الفاظ بھی ہو۔ وسیع معلومات کے لئے اس کا مطالعہ بھی وسیع ہونا چاہئے۔

مضمون نگاری کے لئے موضوع کی کوئی قید نہیں، کسی بھی موضوع کا احاطہ کیا جاسکتا ہے جیسے سیاسی، سماجی، معاشری، تہذیبی، اخلاقی، اصلاحی اور طنزیہ و مزاحیہ وغیرہ۔ اُردو میں مضمون نگاری اس طرح پروان چڑھی کہ تقریباً نثر نگاروں نے اس صنف پر طبع آزمائی کی۔ اُردو نثر کا دامن مشہور و

---

[1] مختصر تاریخ اُردو ادب   ڈاکٹر سید اعجاز حسین   ص ۲۱۵

معروف نثر نگاروں کے مضامین سے پر ہے۔ سرسید احمد خاں، حالؔی، آزاد، عبدالحق، سجاد حیدر یلدرم، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، وحیدالدین سلیم، فرحت اللہ بیگ، محی الدین زور، خواجہ حسن نظامی اور پطرس بخاری وغیرہ کے علمی تہذیبی اور اخلاقی مضامین سے اُردو ادب میں بہترین اضافہ ہوا۔

مقالہ نگاری

مقالہ کے لغوی معنی قول، مقولہ یا آرٹیکل اور تحریر کے ہیں۔ یہ سنجیدہ علمی و تحقیقی موضوع پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ مضمون اور انشائیہ سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اس کا موضوع ہی اس کی شناخت ہوتا ہے۔ رسائل میں شائع ہونے والے علمی موضوع پر مشتمل مضمون کو بھی مقالہ کہتے ہیں اور عام طور پر کسی یونیورسٹی کے تحت ایم۔فل، پی۔ایچ۔ڈی اور ڈلٹ کے لئے لکھی جانے والی علمی و تحقیقی کتاب کو بھی مقالہ کہا جاتا ہے۔ ان مقالوں میں ادبی، سائنسی، تنقیدی، تہذیبی اور تاریخی کسی بھی موضوع پر تحقیقی مواد پیش کیا جاتا ہے، جو سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ مقالہ نگار کی شخصیت عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ادبی مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ مولانا حالؔی علامہ شبلؔی کے سنجیدہ موضوع پر لکھے ہوئے مضامین بھی ''مقالاتِ حالؔی و مقالاتِ شبلؔی'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ''مقالاتِ آزاد'' کے عنوان سے بھی مولانا آزاد کے مضامین کا مجموعہ ملتا ہے، اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مقالہ طوالت کا پابند نہیں ہوتا بلکہ سنجیدہ علمی موضوع ہی مقالے کے لئے ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ مقالے طوالت پر بھی مبنی ہوتے ہیں اور مختصر بھی۔ مختلف موضوعات پر سنجیدگی سے مقالہ نگار اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی سنجیدگی اور علمیت سے متعلق ڈاکٹر سید محمد حسین اپنے مضمون ''ادب کی ایک خاص صنف انشائیہ'' میں تحریر کرتے ہیں :

> ''مقالہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور بصیرت ہوتی ہے، مقالہ نگار کسی امر پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ روشنی صاف و شفاف ہوتی ہے اس کی تیز شعاعوں سے نفسِ تحریر کے مختلف گوشے منور و نمایاں ہوجاتے ہیں۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور موضوعِ تحریر یا نفسِ مضمون

سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں"۔[1]

وہ مقالہ اور انشائیہ کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"مقالہ ہمیں سنجیدگی بخشتا ہے، اس سے ہم میں تہذیب و متانت آتی ہے انشائیہ ہمیں غیر سنجیدہ بناتا ہے۔ اس سے ہم میں رندی اور آوارہ خیالی آتی ہے"۔[2]

مراسلہ

مراسلہ کے لغوی معنی خط یا نامہ کے ہیں اور مراسلت سے مراد باہمی خط و کتابت کرنا ہے۔ کوئی بھی نامہ جو بذریعہ ترسیل آئے، مراسلہ کہلاتا ہے۔ مراسلہ بھی مکتوب نگاری یا خطوط نگاری کی ایک قسم ہے لیکن یہ نجی خطوط کی طرح شخصی یا ذاتی نہیں ہوتے۔ عام طور پر اخبارات یا رسائل میں بھی ایڈیٹر کے نام قارئین کے مراسلے شائع ہوتے ہیں، جو رسائل یا اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین، افسانوں اور غزلیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کے معیاری یا غیر معیاری ہونے سے متعلق قارئین اپنی رائے سے مدیر کو واقف کرواتے ہوئے اپنی پسند اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں کیوں کہ رسائل یا اخبارات میں شائع ہونے والے مشمولات ہی رسائل یا اخبارات کے معیار کے ضامن ہوتے ہیں۔ یہ مراسلے "قارئین کے قلم سے" یا "قارئین کہتے ہیں" وغیرہ کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں، جو بھی قارئین کے لئے کھلی کتاب کی مانند ہوتے ہیں۔ اس کا موضوع تحقیقی یا تنقیدی ہوتا ہے۔

صحافت

صحافت کے لغوی معنی اخبار نویسی کے ہیں۔ اُردو صحافت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ صحافت کو پریس کی دین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ جب سے پریس کا آغاز ہوا اسی وقت سے صحافت کا بھی آغاز ہوا۔ اُردو صحافت کا آغاز ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر سے ہوا۔ ملک کے مختلف حصوں سے اُردو اخبارات نکلنے لگے۔ جن میں اُردو اخبار دہلی، اودھ اخبار ۱۸۵۸ء، آگرہ اخبار ۱۸۶۳ء اور رام

---

[1] اُردو نثر کا فنی ارتقاء ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۲۱۲،۲۱۳

[2] اُردو نثر کا فنی ارتقاء ڈاکٹر فرمان فتح پوری ص ۲۱۲،۲۱۳

پور ۱۸۶۶ء کے نام لئے جاسکتے ہیں۔اخبارات روزانہ اور ہفتہ وار ہر دو طرح سے نکلتے ہیں۔"اودھ پنچ" ۱۸۷۷ء اور اخبار" پیسہ" ۱۸۸۶ء کے نام اس دور کے اخباروں میں لئے جاتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند جین صحافت کو غیر ادبی صنف قرار دیتے ہیں، ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ اُردو کے کئی بلند پایہ ادیب صحافی بھی رہے ہیں۔چنانچہ غیر ادبی صنف ہونے کے باوجود اس میں ادبی رنگ جھلکتا ہے۔پروفیسر گیان چند جین کے مطابق صحافت کا تعلق سیاست سے ہے، ادب سے نہیں۔

دراصل صحافت کا آغاز اسی وقت سے ہوتا ہے جب ملک کے عوام میں سیاسی شعور بیدار ہوا۔کئی سیاسی تحریکیں چلائی گئیں۔ملک کے عوام غلامی کی زندگی سے غیر مطمئن ہوئے اور ایک انقلاب کا جذبہ ان میں پیدا ہوا۔ابتداء میں جو اخبار نکلے اس میں زیادہ تر ادبیت اور کم سے کم سیاست ہوتی تھی منشی سجاد حسین کا اخبار" اودھ پنچ" بھی اسی نوعیت کا اخبار تھا۔بلکہ اس دور میں جتنے بھی صحافیوں کے نام ملتے ہیں جیسے عبدالحلیم شرر، مولانا محمد علی جوہر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی وغیرہ پہلے ادیب اور بعد میں صحافی ہوئے لہٰذا ان کی صحافت پر ادبیت غالب رہی۔

پروفیسر گیان چند جین کے مطابق ظفر علی خاں، جالب دہلوی، چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک کا شمار ایسی شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھیں پہلے صحافی اور بعد میں ادیب ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اخبار کے لغوی معنی خبر کا کاغذ، پرچہ یا ملک کا روزنامچہ کے ہیں۔مطلب یہ کہ خبروں کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔جس اخبار میں زیادہ سے زیادہ اعلیٰ معیاری اور حقائق پر مبنی خبریں شائع ہوتی ہیں، صحافت کے میدان میں وہی اخبار معیاری سمجھا جاتا ہے۔

محمد علی جوہر ۱۸۷۹ء تا ۱۹۳۱ء

یہ رام پور میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔علی گڑھ سے انھیں آکسفورڈ یونیورسٹی بھیجا گیا، جہاں سے انھوں نے گریجویشن کی تکمیل کی۔اس کے بعد

مہاراجہ بڑودہ کے ہاں ملازمت کا موقع ملا، اسی اثناء میں انھوں نے ''کامریڈ'' جاری کیا جو قومی جذبات سے لبریز تھا۔ یہ ٹائمز آف انڈیا میں بھی اپنے مضامین دیتے رہے۔ یقیناً انگریزی زبان میں مہارت آکسفورڈ یونیورسٹی کی دین تھی۔ محمد علی جوہر کا اخبار ''ہمدرد'' جو دہلی سے نکلتا تھا بہت مقبول ہوا۔ انگریزی اور اُردو دونوں کی انشاء پردازی میں محمد علی کو ملکہ حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ تقریر بھی دلائل کے ساتھ کرتے، اعلیٰ درجہ کے مقرر کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ ساتھ ہی شاعر بھی تھے اس میں جوہر تخلص کیا کرتے تھے۔ محمد علی نے صحافت کو بڑی حد تک پروان چڑھایا، تقریر اور تحریر دونوں میں عوام کا مفاد ملحوظ خاطر ہوتا۔ محمد علی کا شمار مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے اس حقیقت کے پیش نظر ان کی صحافت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میر بشارت علی جالب ۱۸۴۷ء تا ۱۹۳۰ء

یہ بھی شاعر انشاء پرداز اور صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ اکبر شاہ ثانی ان کے جدِ اعلیٰ تھے، چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت شاہی انداز سے ہوئی۔ پہلے حکیم اجمل خاں کے اخبار ''اکمل الاخبار'' کے ایڈیٹر رہے، بعد میں کئی اخبارات کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ ''اودھ اخبار'' کے سلسلے میں لکھنؤ آئے۔ صحافت کے سلسلے میں ملک کے کئی حصوں سے تعلق رہا۔ اخبار ''ہمدرد'' اور ''ہمدم'' دونوں سے تعلق خاطر تھا۔ آخر کار روزنامہ ''ہمت'' جاری کیا، جو آخر عمر تک نکلتا رہا۔ اخبار کا اداریہ لکھنے میں ان کا زیادہ وقت گزرتا۔

ظفر علی خاں ۱۸۷۰ء تا ۱۹۵۰ء

اخبار ''زمیندار'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ بیک وقت شاعر، ادیب، ناول نگار اور صحافی تھے۔ ملک کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کے نتیجے میں انھیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ اخبار ''زمیندار'' نے کافی شہرت پائی۔ ہر طرح کے موضوع کو بڑے موثر انداز میں بیان کرتے۔ صحافت کے علاوہ دوسرے میدانوں سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ شاعر، ادیب اور ناول نگار کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے اداریے صحافت میں نئی روح پھونک دیتے تھے۔ جس میں سیاست، آئینی امور اور تمدن پر بڑے بہترین انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

سید سلیمان ندوی ۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۳ء

جن کا تذکرہ سیرت نگاری یا سوانح نگاری کے تحت آ چکا کہ یہ شبلی نعمانی کے شاگرد رشید تھے۔ شبلی نعمانی کی مشہور سوانح سیرت النبیؐ جو نامکمل تھی، اس کی تکمیل سلیمان ندوی نے کی۔ ایک محقق، ادیب اور جید عالم بھی تھے۔ ان کی کئی تحقیقی تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اپنے استاد شبلی نعمانی کی سوانح ''حیات شبلی'' کے عنوان سے تحریر کی۔ شبلی نے اعظم گڑھ میں جو دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی تھی، اس سے ان کا تعلق بہت گہرا تھا۔ اخبار ''معارف'' جو اعظم گڑھ سے نکلتا تھا، طویل عرصے تک اس کے مدیر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۸ء

اعلیٰ درجہ کے ادیب، مقرر اور انشاء پرداز ہونے کے علاوہ صحافی کی حیثیت سے بھی شناخت رکھتے ہیں۔ صحافت کا آغاز مولانا کی کم سنی سے ہی ہوتا ہے۔ آپ کی خداداد علمی صلاحیت، قابلیت سے متاثر ہو کر ایک پریس کے مالک محمد موسیٰ نے مولانا کو اپنے ہفتہ وار علمی و ادبی صحیفے ''المصباح'' کا ایڈیٹر بنایا، اس وقت ان کی عمر ۱۲ سال تھی یعنی مولانا کم عمری سے ہی میدانِ صحافت کا تجربہ رکھتے تھے۔ یہ صحیفہ کچھ عرصہ چل کر بند ہو گیا۔ مولانا آزاد کو اخبار بینی کا بہت زیادہ شوق تھا۔ مصر اور شام کے صحیفے بھی پڑھا کرتے تھے چنانچہ کچھ ہی عرصے میں مولانا نے اپنا سہ روزہ اخبار ''لسان الصدق'' نکالا جو تقریباً ۱۹۰۴ء یعنی تین سال تک جاری رہا۔ اس میں انھوں نے سرسید کے مذہبی خیالات کی پرزور تائید کی ہے بعد ازاں شبلی نعمانی نے انھیں ندوۃ العلماء کے رسالے ''الندوہ'' کا مدیر مقرر کیا۔ اس طرح صحافت کے میدان میں کافی تجربہ حاصل کرنے کے بعد مولانا نے دو اخبار ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے نام سے نکالے۔ جس طرح مولانا اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے اسی طرح کا جادو ان کی تحریر میں بھی ہوا کرتا۔ جوش و خروش اور عالمانہ بیان نے ''الہلال'' کو بلند درجہ عطا کیا۔ اخبار ''الہلال'' کے دو بڑے مقاصد تھے پہلا تو یہ کہ مسلمانوں میں دینداری کے جذبے کو اُبھارے اور دوسرے یہ کہ ان میں حریت کا جوش پیدا کرتے ہوئے ملک کی آزادی کے لئے کانگریس کے ساتھ انھیں عملی جدوجہد پر آمادہ کرے۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد برطانوی حکومت نے اسے سیاسی مقاصد کے

تحت بند کروادیا۔ تب مولانا نے ۱۹۱۶ء میں ''البلاغ'' جاری کیا، جس میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر کو پیش کیا جانے لگا لیکن کچھ عرصہ بعد یہ بھی بند کر دیا گیا۔

عبدالماجد دریا آبادی ۱۸۹۲ء تا ۱۹۶۰ء

یہ ضلع بارہ بنکی قصبہ دریا آباد سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم یہیں پر حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں میٹرک کامیاب کرنے کے بعد کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کامیاب کیا لیکن کچھ ناگزیر وجوہات کی بناء پر ایم۔اے کی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ لکھنؤ اور پھر حیدر آباد آئے۔ یہاں جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں خدمات انجام دینے لگے لیکن کچھ عرصہ بعد لکھنؤ واپس ہو گئے۔

عبدالماجد دریا آبادی شاعر، ادیب، سوانح نگار اور صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامہ نویس اور نقاد بھی تھے۔ فلسفی کی حیثیت سے ایک کتاب ''فلسفہ جذبات'' لکھی۔ یہ کتاب انھوں نے دارالترجمہ سے وابستگی کے دوران لکھی۔ ابتداء میں شاعری کا شغف تھا ناظر تخلص کرتے تھے۔ اپنا کلام اکبر الہ آبادی کو دکھاتے، اگرچیکہ کم عرصہ ہی شاعری کی لیکن ان کا کلام معیاری ہے۔ اس کے باوجود شاعر کی حیثیت سے انھوں نے شہرت نہیں پائی۔ اس کے برخلاف ان کا نثری سرمایہ بہت وقیع اور علمی حیثیت کا حامل ہے۔

سوانح نگار کی حیثیت سے ان کی تصنیف ''حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات'' ملتی ہے جس میں انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات زندگی قلم بند کئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصنیف ''محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق'' میں محمد علی جوہر کے واقعات ملتے ہیں۔ ''اکبر نامہ'' کے نام سے انھوں نے اکبر الہ آبادی کی زندگی کے واقعات کا احاطہ کیا ہے۔

صحافت سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت کے مشہور اخباروں ''ہمدم'' اور ''ہمدرد'' سے وہ وابستہ رہے۔ صحافی کی حیثیت سے ان کے اخبار ''سچ''، ''صدق'' اور ''صدق جدید'' منظر عام پر آئے۔ ان اخباروں میں ان کے کالم ''سچی باتیں'' کو قارئین نے بے حد پسند کیا۔

''زود پشیماں'' کے نام سے ایک ڈرامہ بھی انھوں نے لکھا، جس میں معاشرے کی خامیوں پر روشنی ڈالی۔ انشاء پرداز کی حیثیت سے ان کی تصنیف ''انشائے ماجد'' ملتی ہے۔ یہ انشائیے اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ایک نقاد اور انشاء پرداز کی حیثیت سے ان کی شناخت کرواتا ہے۔ عبدالماجد نے ترجمہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت بنائی۔ ترجمہ نگار یا مترجم کے لئے ہر دو زبانوں میں مہارت اور عبور ضروری ہوتا ہے۔ گویا انھیں ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

ان کے عالمانہ مضامین میں خیالات بلند پایہ ہیں لیکن اندازِ بیان شگفتہ ہے وہ اُردو نثر کے مختلف اصناف سے وابستہ رہے اور کئی زاویوں سے انھوں نے اپنی شناخت بنائی لیکن ان کا اندازِ بیان ہر صنف کی مناسبت سے بدلتا رہا اور ہر انداز دلچسپ رہا۔

تذکرہ نگاری

تذکرے کے لغوی معنی ذکر کرنے کے ہیں۔ تذکرہ نگاری بھی اُردو کے نثری اصناف میں ایک صنف کی حیثیت رکھتی ہے، تذکرہ وہ نثری صنف ہے جس میں تذکرہ نگار کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اس میں شعراء، ادیبوں، صوفیوں اور محدثین کا ذکر اور ان کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں۔

اُردو میں تنقیدی تصانیف سے قبل تذکرہ نگاری مروج تھی۔ تذکرے تاریخ ادب کا بھی احاطہ کرتے اور اس میں شعراء کے کلام سے متعلق تنقیدی اشارے بھی ملتے ہیں۔ اس طرح ادب کی تاریخ و تنقید دونوں تذکرے میں سمٹ آئے۔ تنقیدی اعتبار سے تذکروں کی اہمیت اس لئے ہے کہ انھیں تنقید کے ابتدائی نقوش کی حیثیت حاصل ہے۔ تذکرہ نگاری سے قبل شعراء کے بیاض یا کشکول ملتے ہیں، جس میں لوگ شعراء کا کلام اپنی یادداشت کے لئے تحریر کرلیا کرتے۔ تذکرہ نگاری کی بنیاد یہی بیاضیں ہیں۔

تذکرہ نگاری کا آغاز و ارتقاء

تذکرہ نگاری کا رواج سب سے پہلے یونان میں ملتا ہے، جس کے بعد عربی میں اس کا رواج ہوا۔ یقیناً یونانی زبان کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ لیکن عربی میں تذکرہ نگاری کو اتنا فروغ نہیں ہوا۔ اک

طویل عرصہ بعد عربی کا پہلا تذکرہ ''طبقات الشعراء الجاہلین'' اور ''طبقات الشعراء الاسلامین'' کے نام سے دو جلدوں میں لکھا گیا۔ اس کا تذکرہ نگار ابو عبداللہ بن سلام الجمعی تھا۔ ۸۴۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔

حسبِ روایت عربی سے تذکرہ نگاری فارسی میں پہنچی۔ فارسی کا پہلا تذکرہ ''لباب الالباب'' کے نام سے ملتا ہے جسے سدید الدین عوفی نے ۱۲۲۱ء میں لکھا۔ یہ فارسی شعراء سے متعلق ہے۔

اُردو شعراء سے متعلق فارسی زبان میں تذکرے ۱۸ ویں صدی کے وسط میں لکھے گئے۔ دوسری تمام اصناف کی طرح تذکرہ نگاری کی روایت فارسی سے اُردو زبان میں آئی۔

اُردو زبان کا پہلا تذکرہ ''گلشن ہند'' کے نام سے مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں لکھا لیکن اس سے قبل ۵۲-۱۷۵۱ء میں میر تقی میرؔ نے ''نکات الشعراء'' کے نام سے اُردو شعراء کا تذکرہ فارسی زبان میں لکھا۔ بعد میں جتنے بھی تذکرے لکھے گئے ان تمام میں نکات الشعراء کا انداز ملتا ہے۔ نکات الشعراء کے بعد فارسی زبان میں لکھے جانے والے اُردو شعراء کے کئی تذکرے ملتے ہیں۔ میر کے تذکرے کے فوراً بعد جنوبی ہند میں دو تذکرے ''گلشن گفتار'' حمید اورنگ آبادی اور ''تحفۃ الشعراء'' افضل بیگ قاقشال نے فارسی میں لکھے۔

۵۳-۱۷۵۲ء میں شمالی ہند میں فارسی زبان میں دو تذکرے ''تذکرۂ ریختہ گویاں'' اور ''مخزنِ نکات'' کے نام سے ملتے ہیں، جنھیں بالترتیب فتح علی حسینی گردیزی اور قائم چاند پوری نے تحریر کیا ہے۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں کئی تذکرے لکھے گئے، ان کی زبان بھی فارسی تھی۔ ان تذکرہ میں لچھمی نارائن شفیق کا تذکرہ ''چمنستان شعراء'' ۶۲-۱۷۶۱ء، ''تذکرۂ شعرائے اُردو'' ۱۷۷۵ء، میر حسنؔ اور مصحفیؔ کے دو تذکرے ''تذکرۂ ہندی'' ۹۵-۱۷۹۴ء اور ''ریاض الفصحاء'' اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی تذکرے مختلف ناموں سے ملتے ہیں۔

اُردو میں تذکرہ نگاری

اُردو نثر کی ترقی میں فورٹ ولیم کالج نے نمایاں کردار ادا کیا، جس کا ذکر فورٹ ولیم کالج کی

خدمات کے سلسلے میں کیا جا چکا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی زبانوں کے صدر ڈاکٹر جان گل کرسٹ چاہتے تھے کہ انگریز افسر نہ صرف یہاں کی زبان بلکہ یہاں کی تہذیب سے بھی واقف ہو جائیں۔ اس سلسلے میں مرزا علی لطف نے ۱۸۰۱ء میں "گلشن ہند" لکھا جو "تذکرۂ گلزار ابراہیم" کا اُردو میں ترجمہ ہے۔ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں کل ۶۸ نامور صاحب دیوان شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ اس تذکرے کو عبداللہ خاں نے ۱۹۰۶ء میں شبلی نعمانی کی تصحیح اور مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ حیدر آباد سے شائع کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ گلزارِ ابراہیم میں جن نامور شعراء کا ذکر بہت مختصر کیا گیا تھا، مرزا علی لطف نے ان کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ چنانچہ تذکرے کی اہمیت دوبالا ہو گئی۔

طبقاتِ شعرائے ہند

مولوی کریم الدین نے ۴۸-۱۸۴۷ء میں "طبقات شعرائے ہند" لکھا، یہ تذکرہ اول الذکر تذکرے کے مقابلے میں ضخیم ہے کیوں کہ اس میں تذکرہ نگار نے کل ۹۶۴ شعراء کا ذکر کیا ہے۔ اس میں شعراء کے حالات تفصیلی اور مستند ملتے ہیں۔ تذکرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

گلستانِ بے خزاں

میر قطب الدین نے ۱۸۴۹ء میں "گلستانِ بے خزاں" کے نام سے ایک تذکرہ تحریر کیا، یہ "نغمہ عندلیب" کے نام سے بھی شہرت رکھتا ہے۔ میر قطب الدین نے جب میر مصطفےٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ "گلشن بے خار" پڑھا تو اس کے جواب میں "گلستانِ بے خزاں" تحریر کیا جو ۱۸۷۴ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۸۲ء میں اس تذکرے کو اتر پردیش اُردو اکیڈمی نے شائع کیا۔

گلستانِ سخن

مرزا قادر بخش صابر نے ۱۸۵۵ء میں تحریر کیا۔ اس میں کل ۵۴۱ شعراء کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۹ ویں صدی کی ابتدائی نصف صدی کے شعراء کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے ابتدائی حصے میں فن شاعری سے متعلق مفید معلومات بھی پیش کی گئیں ہیں۔

سخن شعراء

عبدالغفور نساخ نے سخن شعراء کے نام ۱۸۶۴ء میں ایک تذکرہ تحریر کیا، یہ بھی ''گلستانِ بے خزاں'' کی طرح ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل ۲۴۰۰ شعراء کا مختصر ترین انداز میں ذکر ملتا ہے۔ ایسے شعراء کا ذکر بھی ہے جن کا کلام اب ناپید ہے۔ اس کے علاوہ اُردو میں کئی تذکرے لکھے گئے۔ ''گلدستہ نازنینان''، ''انتخاب یادگار'' اور ''شمیم سخن'' کے علاوہ ''آبِ حیات'' جیسے اُردو تذکرے منظر عام پر آئے۔

آبِ حیات

محمد حسین آزاد کی مایہ ناز تصنیف آبِ حیات ۱۸۸۰ء میں تصنیف کی گئی، جس سے متعلق نقادوں اور محققین کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ نگاری کی آخری اور تاریخ ادب اور تنقید کی پہلی کڑی ہے۔ اسے اُردو ادب میں لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ تذکرہ نگاری کی آخری لکڑی ہونے کے سبب اس کا انداز ماہرانہ ہے۔ اس میں محمد حسین آزاد نے شعراء کے حالات کے ساتھ ساتھ تفصیلی انداز میں ان سے متعلق معلومات پیش کی ہیں تا کہ ان کی شخصیتوں سے متعلق قاری کے ذہن میں اںک خاکہ بن جائے۔ اس۔

محمد حسین آزاد نے اس میں اُردو زبان لی تاریخ اور ادب کو لکھنے کی ابتدائی کوشش کی ہے اور اسی کے سبب آئندہ چل کر اُردو میں تاریخ ادب اور تنقیدی تصانیف کا رواج ہوا۔

تذکرہ نگاری کے سلسلے میں فارسی تذکرہ کو طرزِ قدیم پر مبنی تذکرے قرار دیا جاتا ہے تو اُردو تذکروں کو طرزِ جدید پر مبنی تذکرے مانا جاتا ہے۔ آبِ حیات کے بعد تاریخ ادب کے لکھنے کا رواج ہونے کے باوجود کئی کتابیں تذکروں کے انداز میں لکھی گئیں ہے۔

۲۰ ویں صدی میں لالہ سری رام نے ''خم خانہ جاوید'' کے نام سے ضخیم تذکرہ مرتب کرنے کا آغاز کیا۔ پانچ جلدیں منظر عام پر آنے کے بعد لالہ سری رام کی موت کے سبب یہ کام نامکمل رہ گیا۔

''اُردو نثر کا فنی ارتقاء'' میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری تذکرہ نگاری کے فن کے تحت لکھتے ہیں :

''اُردو تذکروں پر جو مقالات یا کتابیں اب تک سامنے آئی ہیں، ان میں سے

کسی میں بھی بیس یا پچیس قدیم تذکروں سے زائد کا ذکر نہیں آیا۔ حالاں کہ نکات الشعراء مولفہ ۱۱۶۵ھ م ۱۷۵۲ء سے لے کر آبِ حیات مولفہ ۱۲۹۷ھ م ۱۸۸۰ء تک اس سے کئی گنا زائد تذکروں کے حوالے مختلف جگہ نظر آتے ہیں۔ تفصیل کے لئے نگار پاکستان کا تذکرہ نمبر ۱۹۶۵ء دیکھیے، اس میں راقم الحروف نے پچاس سے زائد تذکروں کا تعارف کرایا ہے اور ان تذکروں میں جن شعراء کا ذکر آیا ہے ان سب کی فہرست بھی دے دی ہے لیکن یقین ہے کہ تذکروں کی تعداد اس سے بھی زائد ہوگی"۔ [۱]

تذکرہ نگاروں کی ادبی حیثیت کے اعتبار سے زورؔ صاحب نے اُردو تذکروں کو تقسیم کیا ہے۔

☆☆☆

۱؎ اُردو نثر کا فنی ارتقاء، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ۲۹۷-۲۹۶

خامہ سے قرطاس تک

دیڑھ دہائی پر مبنی طویل تدریسی تجربے کے تحت ڈاکٹر سیدہ زہرا بیگم نے طلباء کی رہنم
ان کی نصابی ضروریات کی تکمیل کے لئے پہلی کتاب ''مختصر تاریخ اُردو ادب اور اصنافِ شا
لکھی۔ اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور طلباء کے حلقے میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی نے ان کے حوصلے کو
بلند اور قلم کی روانی کو برقرار رکھا۔ اب اُسی مقصد کے تحت ان کی دوسری کتاب ''مختصر تاریخ اُردو
ادب اور اصنافِ نثر'' منظرِ عام پر آگئی۔ یہ کتاب بھی انٹرمیڈیٹ، ڈگری اور پی جی کے طلباء کی
تدریسی ضرورتوں کی تکمیل کرتی ہے۔ اس کے تحریر کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ طلباء تعلیمی سفر کی
دشواریوں سے دوچار نہ ہوں بلکہ بآسانی اس راہ ناہموار کو طئے کرسکیں اور ساتھ ہی سائنس اور کامرس
کے طلباء میں اُردو زبان وادب سے اُنسیت بھی پیدا ہو۔

''مختصر تاریخ اُردو ادب اور اصنافِ نثر'' میں اُردو نظم ونثر کے فرق کو واضح کرتے ہوئے
سیدہ زہرا نے کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے، جس میں اُردو نثر کی عہد بہ عہد ترقی کو ابتداء
سے عصرِ حاضر تک مختصر اور جامع انداز میں قلمبند کیا ہے۔ تاریخ جیسے خشک مضمون کو سیدہ زہرا کے قلم کی
شگفتگی اور تسلسل نے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ کتاب کا آخری باب اُردو نثر کی تمام اصناف کا احاطہ کرتا
ہے۔ تمام اصنافِ نثر کا یکجا بیان طلباء کے لئے مسرور کن ثابت ہوگا۔

کتاب سامنے ہے اس لئے دوسرے ابواب کی تفصیل بیان نہیں کروں گی۔ تاہم یہ اشارہ
کرتی چلوں کہ تحقیق اور تاریخ کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نقشِ اول سے نقشِ ثانی بہتر ہے۔ یقیناً
نقشِ ثالث تنقید وتحقیق کی تفصیل کے ساتھ خوب تر ہوگا۔

''اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طئے''

ڈاکٹر ریاض فاطمہ تشہیر
معتمد بوستانِ اشہر پبلی کیشنز، پرانی حویلی